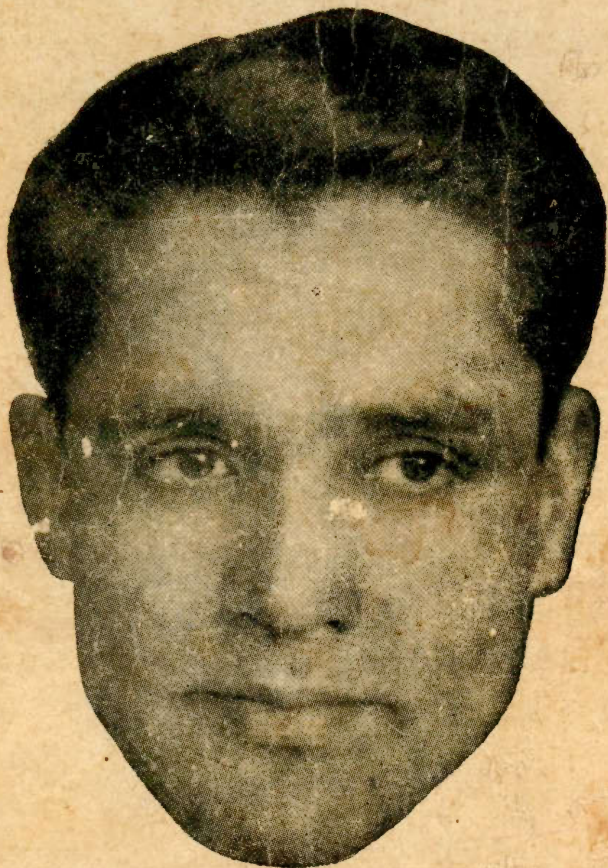


شفيق الرحمن



سنگوف

۲۰/۲

پتنگونہ

مفتاح دوست و رفیق
محبوب و متعلق

تسکونے

شفیق الرحمن

البتیا ، چوک انارکلی ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طالب : مکتبہ جدید پریس لاہور
ناشر : محمد حنیف رائے
البیان، چوک انار، کلی، لاہور

ترتیب

۷ بڑی آہا

۲۱ دو تارے

۴۵ نسرین

۶۹ فلا سفر

۹۱ سماج

۱۰۵ ڈرپوک

۱۲۱ سارٹھے چھ بجے

۱۴۷ یونہی

۱۷۱ مشورے

۲۰۱ دیکھئے صفحہ فلاں

۲۱۱ شیطان



بڑی آپا

وہ بھیا کے ساتھ اکثر ہمارے ہاں آیا کرتا تھا۔ کئی سال سے دونوں سختے پڑھتے تھے۔ پہلے پہل بھیا جب اُس کی باتیں کیا کرتے تو میرے دل میں گودی سی ہونے لگتی۔ وہ بڑے فخر سے سینہ چھلا کر کہتے۔ آج رفیق نے یہ کیا، وہ کیا اتنے نمبر لے۔ فلاں کھیل میں حصہ لیا۔ ویسے بھیا اور اس کی جوڑی بھی خوب تھی۔ ایک سے قد، ایک سے جسم اور ایک سی عادتیں۔ دونوں سینما کے عاشق، دونوں کھیل کود کے دیوانے۔ جب سائیکلوں پر ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھے سڑک پر جاتے تو دُور سے پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ البتہ ایک فرق نمایاں تھا۔ وہ یہ کہ بھیا ذرا سانولے تھے اور اس کا رنگ کھلا ہوا تھا۔ اس لئے جو نیلے اور کالے سوٹ اس کے رنگ کو نمایاں کر دیتے تھے وہ بھیا کو اتنے اچھے نہیں لگتے تھے اور ہاں ایک بات اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ اس کی ناک پر ہر وقت کالے شیشوں کی ایک عینک رکھی رہتی تھی۔ بھیا کے بنانے پر معلوم ہوا کہ جناب سینما بے حد دیکھتے ہیں۔ جس سے آنکھیں کبھی کبھی سُرخ ہو جاتی ہیں۔ اس لئے یہ عینک لگا رکھی ہے۔

بڑی آہ

میں اُسے چھپ چھپ کر نشیوں میں سے اور کواڑوں کی آڑ سے دیکھا کرتی
دراز قد، چھریا اور ورزشی جسم، پکھرے ہوتے بال، چہرے پر ایک عجیب
قسم کی معصومیت۔ سب بات کرتا، تو بچوں کا سا مجھلا پن چہرے پر آ جاتا۔
کچھ ایسا حسین بھی نہ تھا۔ نہ ہی خط و خال ایسے دلکش تھے۔

وہ تقریباً ہر روز ہمارے ہاں آیا کرتا۔ بعض اوقات بھیا پہلے چلے آتے
اور شام کو اس کا انتظار کیا کرتے۔ جس روز وہ نہ آتا، بیچین ہو جاتے۔ بار بار
درازے تک جاتے اور گھڑی دیکھتے۔ کبھی مجھ سے دُلت پوچھتے اور جیسے ہی
اس کے سائیکل کی گھنٹی کی آواز کانوں میں آتی۔ ان کا چہرہ دمک اُٹھتا۔ فوراً دوڑ
کر دوسرے کمرے میں چھپ جاتے۔ وہ بھاگا بھاگا آتا، نوکر آگے بڑھ کر کہہ دیتا
”وہ تو باہر چلے گئے۔“ یہ مذاق ہر بار کیا جاتا۔ مگر وہ ہمیشہ اسے سچ سمجھ لیتا اور
واپس مڑنے لگتا۔ بھیا دوڑ کر اس سے چمٹ جاتے اور پھر جو باتیں شروع ہوتیں
تو بس خدا کی پناہ، رات کے بارہ بارہ بجے تک دونوں بیٹھے رہتے۔ وہ ریڈیو
والے کمرے ہی میں بیٹھتے اور ریڈیو کو ہمیشہ بند کر دیتے کہ باتوں میں غل ہوتا
ہے۔ میرا جی بڑا جلتا، اگر یہ داستانِ امیر حمزہ چھیڑتی ہے تو اس کمرے میں
کیوں بیٹھتے اور پھر ریڈیو بند کیوں کر دیتے ہیں۔ جانتے ہیں نا کہ میں اس بات
سے چڑتی ہوں۔

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں کواڑوں سے لگی ان کی باتیں سن رہی ہوں۔ یکایک
کسی کے آنے کی آہٹ سنائی دی، میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ پسینہ پسینہ
ہو گئی۔ اگر اتنی دیکھ لیں تو کیا کہیں۔ وہاں سے ایسی بھاگتی کہ اپنے کمرے میں آ کر

شکو۔ قہ

دُم لیتی۔ توبہ توبہ ایک لڑکی کے لئے اس سے زیادہ اور کیا بے شرمی ہو سکتی ہے؟ میں قسم کھاتی کہ پھر اُسے کبھی نہیں دیکھوں گی۔ بھلا اس میں کیا خاص بات تھی آخر؟ یُونہی معمولی لڑکوں جیسا تھا۔ بھیا کو اچھا لگتا تھا تو اس کے معنی یہ تو نہیں کہ مجھے بھی اچھا لگے۔ اور پھر ہر بار میں ہی دیکھتی تھی۔ اُس نے کس روز کوشش کی کہ مجھے دیکھے۔

امشاء اللہ بھیا میں ویسے تو ساری خوبیاں تھیں مگر ایک ذرا زیادہ نمایاں تھی۔ وہ یہ کہ سگریٹ اتنی بُری طرح پیٹے تھے کہ کوئی حد تھی نہ حساب۔ امی نے بہتیرا سُر کھپایا۔ ابا نے بہتیرا سمجھایا۔ وہ بھی تمباکو کے نقصانات پر لیکچر دیتا رہا۔ مگر شاباش ہے بھیا کو، ایسے چکنے گھڑے نکلے کہ کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ امی سے مُنہ بنا کر کہتے۔ بھلا کب پیتا ہوں سگریٹ، کبھی آپ نے دیکھا بھی ہے مجھے پیتے ہوئے۔ اور واقعی وہ گھر میں پیتے بھی نہیں تھے۔ میں اور ننھا ہم دونوں اُن کے پیچھے جاسوس لگے ہوتے تھے۔

ایک روز شام کو میں کالج سے گھر ذرا دیر سے پہنچی۔ آہستہ سے پردہ ہٹا کر ذیلے پاؤں اندر داخل ہوئی۔ میری آنکھیں مارے خوشی کے چمک اُٹھیں۔ بھیا ریڈیو کے سامنے آرام کر سی پر میری طرف پیٹھ کئے بیٹھتے تھے۔ سگریٹ کا دھواں ایک عجیب شان سے نکل رہا تھا۔ ویسے تو اپنی طرف سے پوری مورچہ بندی کی ہوئی تھی۔ کرسی میں دھنسنے ہوئے بیٹھتے تھے اور بیٹھتے بھی کیا تھے۔ بس لیٹے ہوئے تھے۔ سُر پر اڑا ہیٹ رکھا ہوا تھا تا کہ دُور سے سُر اچھی طرح نظر نہ آ سکے اور دیکھنے والا یہی سمجھے کہ آرام کرسی کی پشت پر ایک ہیٹ رکھا ہے۔ میں نے

آہستہ سے کتابیں میز پر رکھیں اور قالین پر دبے پاؤں آگے بڑھی۔ ایک لمبے سے ہیٹ ایک طرف پھینکا اور دوسرے سے سگریٹ چھین لی۔ بھیا بڑا کر اٹھے۔ تو بہ — جو نظارہ میں نے دیکھا۔ بس دھک سے رہ گئی۔ یہ بھیا نہیں تھے کوئی اور تھا — یہ رفیق تھا۔ جو اوڑھنی چھوڑ کر بھاگی ہوں تو تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ سامنے سے آتی آرہی تھیں، دروازے میں ان سے زور کی ٹکڑ ہوئی۔ "یا وحشت! آخر یہ بچپنا جاتے گا کب؟" انہوں نے ڈانٹ کر کہا۔

میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر دم لیا۔ آتی کے لیکچر کی آواز برابر کانوں میں آرہی تھی۔ رات کو دیر تک نیند نہ آئی۔ وہ اپنے دل میں کیا کہتا ہوگا کہ یا تو کبھی سامنے نہیں آتی تھی اور یا یکنخت اس قدر بے لکھنی؟ اگر وہ بھیا سے کہہ دے کہ "جناب! میرا آپ کے گھر سگریٹ پینا آپ کی ہمشیرہ صاحبہ پر ناگوار گزرتا ہے۔" تو بھیا کیا کہیں گے کہ کتنی بدتمیز اور بے شرم ہے!

مگر پھر ایک عجیب و غریب خیال نے دل پر سُرور طاری کر دیا، کچھ بھی ہو آخر، اس نے بھی تو مجھے دیکھ لیا تھا نا؟ — مگر کس ٹیلے میں؟ میں نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی، چاکلیٹ رنگ کی شلوار، ویسی ہی قمیض اور ویسا ہی دوپٹہ (جو میں وہیں چھوڑ آئی تھی) — گویا مجھے چاکلیٹ! میں نے اپنے آپ کو کوس ڈالا، میرے پاس بہترین جوڑے موجود تھے۔ اچھی سے اچھی ساڑیاں تھیں۔ کاش میں اس روز چمک دار بارڈر والی، سبز ساڑی پہنے ہوتی، میرے بال بکھرے ہوتے تھے۔ چہرہ سارے دن کی پڑھائی کے بعد کچھ کھلایا ہوا سا تھا مگر شاید بجلی کی روشنی میں قدرے گلابی جھلک آگئی ہو۔

کوئی ہفتہ بعد بھیجا بیمار ہو گئے۔ اچھے بھلے کالج سے آئے۔ شام کو نہ معلوم کیا ہو گیا۔ رات ہوتے ہوتے پلنگ پر دراز ہو گئے۔ آبا جان دورے پر گئے ہوتے تھے۔ امی نوکرانی اور ننھے سمیت دوسرے محلے میں کسی سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ میں اکیلی گھبرا گئی۔ فوراً نوکر کو بھیجا کہ رفیق کو بلا لاتے اور اس کے سوا میں کبھی کیا سکتی تھی؟ نوکر چلا تو گیا مگر میرے دل میں ایک خیال آتا تھا۔ دوسرا جانا تھا۔ بار بار یہ سوچتی تھی کہ اس سے بات کیسے کر سکوں گی؟ سائیکل کی گھنٹی بجی، پردہ اٹھا کر وہ اندر داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو کچھ ٹھسکا۔ پھر بھیجا کی طرف دیکھ کر لپک کر اندر آ گیا۔

”یہ کب سے بے ہوش ہیں؟“ اس نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ میں نے جواب دیا۔ بہت سے دوسرے سوالوں کا بھی الٹا سیدھا جواب دیا۔ یہ بھی میری اور اس کی پہلی بات چیت، وہ بچوں کی طرح شرمارہا تھا۔ سر جھکاتے اور بغیر میری جانب دیکھے کوئی سوال پوچھتا۔ اور میں رُک رُک کر جواب دیتی۔ الفاظ میرے حلق میں اٹک رہے تھے۔

پانچ چھ دنوں میں بھیجا اچھے ہو گئے۔ اس کی ان تھک تیمارداری کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ہم لوگوں میں کافی گھل مل گیا۔ ادھر نہ تھا تھا کہ ہر وقت بھیجا رفو، بھیجا رفو کی رٹ لگاتے رکھتا۔ کتنی بار سمجھایا کہ بے وقوف کہیں کے، اول تو بڑوں کا نام نہیں لیا کرتے اور پھر اگر میں بھی، تو یہ کیا ستم ہے کہ اس بُری طرح سے۔

ہر روز ننھے کی جیب میں چاکلیٹ ہونے۔ کوئی دن ایسا نہ گزرتا کہ جب تنہا اس کے ساتھ سیر کرنے گیا ہو، اور چاکلیٹ کی جگالی کرتا ہوا نہ آیا ہو۔ ایک

روز میں نے تنگ آکر کہہ دیا۔ ”آپ ننھے کی عادت بگاڑ رہے ہیں۔ یہ کیا کہ ہر روز سیر کو بھی لے جائیں اور چاکلیٹ بھی لے کر دیں۔ خواہ مخواہ کا بار ہے نا آپ پر!“

”تو آپ ننھے کو میرے ساتھ جانے ہی کیوں دیتی ہیں؟ شوق سے روکتے یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ جو کوئی بھی میرے ساتھ رہے گا، اس کی عادتیں بگڑ جائیں گی۔“ وہ ہنس پڑا۔

ایک روز میں کالج جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ باہر سے آواز آئی ”تار لے لیجئے!“ بھیا دوڑے گئے اور چیخ کر بولے ”بڑی آپا آرہی ہیں!“

”بڑی آپا آرہی ہیں سچ پچ؟“ میں نے چلا کر پوچھا۔ بھیا تار لے کر امی کو خبر دیتے چلے گئے۔

وہ سال بھر کے بعد آرہی تھیں۔ امتحان پاس کر چکی ہیں۔ پھر وہی شینیاں بگھاریں گی۔ ”میں تو رات بھر سوتی نہیں تھی۔ پڑھنے پڑھتے گردن اکڑ جاتی تھی۔ جب امتحان دیا تو بخار چڑھا ہوا تھا“ گریں بھی خوب جھٹلاؤں گی اس دفعہ، اس ایک سال میں میں بھی خاصی سمجھ دار ہو گئی تھی۔

شام کو آپا آگئیں۔ ہم خوب لپٹ لپٹ کر ملے۔ پھر جو باتیں شرفِ عرض ہوئیں تو رات کے دو بج گئے۔ یکا یک آپا نے ایک عجیب سا سوال کیا۔

”جو تصویر بھیا نے مجھے بھیجی تھی۔ اس میں ایک اجنبی لڑکا بھی تھا، کون ہے مہلا وہ؟“

”کوئی دوست ہے اُن کا“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”وہ تو مجھے بھی پتہ ہے، نام کیوں نہیں بتاتی اس کا۔“
 رفیق ہے اُس کا نام!“ میں نے کہا۔
 ”نام تو بڑا اچھا ہے اور ویسے خود بھی اچھا ہے، ہے نا؟“
 ”مجھے کیا معلوم؟ — ہوگا۔“ میں نے مُنہ بنا کر کہا۔
 مجھے آپا کی یہ تعریف بڑی ناگوار لگی۔ میں نے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔
 ”کیوں نیند آگئی کیا؟ —“ وہ بولیں۔
 ”ہاں!“

دوسرے روز آپا نے اُسے دکھا۔ باتیں کیں۔ کمرے میں میں اور بھینا بھی بیٹھے تھے مگر کیا مجال جو آپا نے کسی اور سے ایک بات بھی کی ہو۔ رفیق کے پیچھے اس طرح پڑیں کہ اس غریب کاناک میں دم آگیا۔ آپا کے چہرے پر مسکراہٹ بھئی۔ اور رفیق کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ صونے میں گھسنا جا رہا تھا۔ بار بار باتوں کا رخ پلٹا تھا کہ چھٹکارا ملے۔ ادھر میں بے چین ہو رہی تھی۔ آخر آپا کا مطلب کیا ہے اس قسم کے سوالوں سے؟ بھینا سے کب واقفیت ہوتی تھی؟ گھر میں آنا جانا کب سے ہوا؟ یہ لڑکی (میری طرف اشارہ کر کے) تمہیں سناقتی تو نہیں اچھی لڑکی ہے نا! تم بڑے شرمیلے ہو، کیوں ہو اتنے شرمیلے؟ روز آیا کرتے ہونا؟ — آپا کو کیا ہو گیا تھا؟

اس کے بعد آپا کا زیادہ وقت آئینے کے سامنے گزرنے لگا۔ صبح ہی سے شام کے لئے کپڑے چن لئے جاتے۔ شام کو سیر سے دواڑھائی گئے پہلے میک اپ شروع ہو جاتا۔ رفیق بھی پہلے سے زیادہ بن سنور کر آئے رہا۔

بکھرے ہوئے بال سنورنے لگے۔ ٹائی بھی کوٹ کے رنگ کے مطابق ہوا کرتی۔
 یا شاید یہ تبدیلی مجھے ہی معلوم ہوتی ہو۔ کیونکہ آپا ان دنوں مجھے زہر دکھاتی۔ دیتی
 تھیں۔ بات بات پر رفیق، ہر وقت اسی کا نام۔ جب وہ آجاتا تو گویا آپا کی
 جان میں جان آجاتی۔ ایسی گرویدہ ہوتیں کہ کسی تیسرے کا خیال نہ رہنا۔ رفیق
 بہت شرماتا۔ باتیں کرتے کرتے میری طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتا۔ گویا سکاٹ
 کرتا کہ دیکھ لو۔

آپا سے میں بے حد محبت کرتی تھی.... ہم سب بہن بھائیوں میں وہ سب
 سے بڑی تھیں۔ مجھ میں اور ان میں کوئی چھ سال کا فرق ہوگا۔ ویسے بھی وہ مجھے
 بہت اچھی لگتی تھیں۔ مگر جب وہ رفیق کا ذکر کرتیں، یا اس سے باتیں کرتیں تو
 میں دیوانی سی ہو جاتی۔ بہتیرا دل کھینچتی کہ یہ اسے کہیں لے کر بھاگنے سے تو
 رہیں۔ کچھ دنوں کے لئے آتی ہیں۔ پھر چلی جائیں گی اور پھر رفیق کو نسا میرا ہو گیا
 تھا۔ فقط یہی تھا کہ مجھے اس سے دلچسپی تھی اور جیسا کہ اس کی باتیں ظاہر کرتی تھیں
 اُسے بھی مجھ سے کچھ نہ کچھ اُنس ضرور تھا۔ نہ تو کبھی اس نے اظہار کیا اور نہ میں نے
 بس اتنی سی بات پر ہر وقت کا چرنا اور اس قدر حسد —
 سارا قصور آپا کا مقوڑا ہی تھا۔ وہ بھی کہاں کا بھولا تھا۔ آخر ہر روز ایسا
 بن، بٹن کر کیوں آتا تھا؟

ایک روز آپا نے اس کی ٹائی پکڑ کر کھینچ لی اور مسکرا کر بولیں "شریہ کہیں کے!
 ہر روز گلابی ٹائی لگا کر آتے ہو۔ جانتے ہو نا کہ میرے پاس گلابی رنگ کی ایسے
 پھولوں والی کوئی ساڑھی نہیں ہے!" میں جل ہی تو گئی گویا اس کا مطلب یہ ہوا

شکوہ

کہ جیسی ساڑھی آپاکی ہو۔ ویسی ہی ثانی رفیق کی ہونی چاہئے! سبحان اللہ! کیا نرالی منطق ہے؟ اور رفیق بھی بس موم کی ناک تھا۔ اگلے روز سے اُس نے وہ ثانی لگانی چھوڑ دی۔ یہ مرد ایورسٹ پر چڑھ جاتیں، سمندر کی تہ تک پہنچ جاتیں۔ خواہ کیسا ہی ناممکن کام کیوں نہ کر لیں۔ مگر عورت کو کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ بعض اوقات ایسی احمقانہ حرکات کر بیٹھتے ہیں کہ اچھی بھلی محبت نفرت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور پھر عورت کا دل — ایک ٹھیس لگی اور بس گیا۔ جانتے ہیں کہ حسد اور رشک تو عورت کی سرشت میں ہے۔ اپنی طرف سے بڑے چالاک بنتے ہیں۔ مگر مرد کے دل کو عورت ایک ہی نظر میں بھانپ جاتی ہے اور پھر رفیق جیسا پگلا تو کوئی بھی نہ ہوگا۔ میں نے ہزار بار اشارتاً ذکر کیا۔ ویسے کئی مرتبہ صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے یہ جو پچھلے نہیں بھاتے مگر اس کے کانوں پر جوں تک نہ ریگی۔

منگل کو ایک بہت اچھی فلم آرہی تھی۔ بھینا نے پروگرام بنایا کہ شام کو فلم دیکھی جاتے۔ رفیق کو بھی بلایا۔ دوپہر کا وقت ہوگا کہ آپا میرے کمرے میں دوڑی دوڑی آئیں۔ "تیرے پاس کوئی کالی ساڑھی ہے؟" انہوں نے پوچھا۔ "اس رنگ کی کیا؟" میں نے وارڈروب میں رکھی ہوئی ایک گہرے چاکلیٹ رنگ کی ساڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں! ایسی نہیں! بالکل سیاہ! جیسے میرے بال ہیں جلیٹا ڈنر سوٹ ہوتا ہے۔" ڈنر سوٹ کا ذکر۔ میں اس نرالی تشبیہ پر حیران رہ گئی آخر منظور دیویر کی اُلٹ پلٹ کے بعد ایک سلک کی سیاہ ساڑھی نکال دی۔ "اور بلاؤز؟" وہ بھی سیاہ رنگ کا؟" میں نے پوچھا۔

”ہاں، بالکل سیاہ رنگ کا۔“

میں نے بلاؤز بھی نکال دیا۔ ان کی باچھیں کھل گئیں۔

”بس ٹھیک ہے، سیاہ جوتے تو میرے پاس ہیں۔“ وہ بھاگ کر کمرے سے نکل گئیں۔

شام ہوئی۔ میں نے ایک سادہ سی سفید ساڑی پہن لی۔ آپا اپنے کمرے سے نکلیں۔ سر سے لے کر پاؤں تک سیاہ لباس میں ملبوس، سفید چہرہ کالے لباس میں چاند کی طرح چمک رہا تھا۔

”آپا آپا! آج آپ کتنی پیاری معلوم ہو رہی ہیں، چشم بد دور۔“
 ”چل جھوٹی ٹہکیں کی، دیکھ تو سہی! ادھر آ بھلا!“ وہ مجھے پکڑ کر آئینے کے سامنے لے گئیں۔ ”لے دیکھ تو اس سادی ساڑی میں بھی مجھ سے ہزار درجہ اچھی ہے۔“ وہ بولیں۔

”خاک اچھی ہوں، آپ تو مجھے بنا رہی ہیں، بس، بھلا کہاں میں اور کہاں۔“
 ساتھ کے کمرے سے بھیا کے بڑ بڑانے کی آواز آئی۔ ”میں تو عاجز آ گیا اس سے۔ یہ رفیق بھی عجیب لڑکا ہے۔ دیکھو تو سہی، اب تک نہیں پہنچا۔“

”کیا اب تک نہیں آیا وہ باؤلا؟“ آپا نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔
 یہ الفاظ کچھ چھپتے ہوئے سے محسوس ہوئے۔ آخر آپا اُسے باؤلا کہنے والی کون ہوتی تھیں؟

”میں نے آج تک ایسا لڑکا نہیں دیکھا۔“ آپا بولیں۔

”اب کب تک انتظار کریں گے۔ چلتے آپا، وہ خود ہی سینا پہنچ جائے گا۔“

بھیانے کہا۔ ہم نے گھڑی دیکھی۔ وقت بہت مختور ارہ گیا تھا۔ اگرچہ آپا مضر تھیں کہ رفیق کا انتظار کیا جائے مگر بھیا نہ مانے۔

ہم سب کاریں جا بیٹھے۔ بھیانے مجھے آگے بٹھایا اور منتھا اور آپا چھپے بیٹھ گئے۔
مخوڑی ہی دور ہو گئے ہوں گے۔ یکا یک بھیانے زور سے آواز دی ”رفیق!“
”ادھر آؤ، ذرا جلدی کرو۔“

”نچے تو آگے بیٹھ جا۔“ آپا نے کہا۔ ”ادھر آ جاؤ رفیق!“

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ رفیق سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ بالکل سیاہ رنگ کا کوٹ، ویسی ہی بو، ویسا ہی جوتا، بھیا نے نچے کو آگے بٹھایا اور وہ پیچھے جا بیٹھا۔ مجھے آگ لگ گئی۔ اب میں سمجھی کہ آپا نے سیاہ ساڑی کیوں پہنی تھی اور رفیق۔ کتنا مکار نکلا۔ آج تک ہمارے ہاں کبھی سیاہ سوٹ پہن کر نہیں آیا۔ ضرور آپا نے فرمائش کی ہوگی۔ میں نے دوبارہ رفیق کی طرف دیکھا۔ سیاہ سوٹ میں وہ آنکھوں میں سایا جا رہا تھا۔

سیلنا پہنچے، آپا نے سرے کی سیٹ پر رفیق کو بٹھایا اور خود ساتھ بیٹھ گئیں۔ انکے بار منتھا بیٹھ گیا۔ اب میری باری تھی۔ میں نے ایک سیٹ چھوڑ دی۔ بھیا کیلئے۔

آپ! — اتنی دُور؟“ رفیق بولا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے یانہیں کہ کیا فلم تھی، جتیا کیا کہہ رہے تھے اور آپا کیا کہہ رہی تھیں۔
بہ عجیب مدھم سی آوازیں میرے کانوں میں آرہی تھیں۔ سر کلایا۔ ہانسا۔ آنکھوں کے سامنے سیاہی اور سفیدی کے چند بے دھنگے سے دھبے پانچ رہے تھے۔ میں ٹک رہی تھی۔ فقط میرے آنسو نہیں نکلے، باقی میرے رونے میں کوئی کسر نہیں

بڑی آپا

رہی۔ آپا اور رفیق ہنس ہنس کے مجھے مارے ڈالتے تھے۔ فلم ختم ہو گئی اور مجھے یہ بھی نہ ملا۔ بھیا نے میرا بازو پکڑ کر ہلایا۔ ”چلو! ارے یہ کیا اونگھ رہی ہو تم؟“ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بھیا اور آپا پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”اب تو میں کار چلاؤں گا!“ رفیق نے میرے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”آپ پیچھے بیٹھے!“ میں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ — وہ حیران رہ گیا۔

”بس یونہی! — آپ وہاں بیٹھے ہوئے اچھے لگتے ہیں!“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ بھونچکا سا رہ گیا۔

”آپ وہاں بیٹھے، آپا کے ساتھ!“ میں نے منہ پھیر لیا۔

وہ اور آپا پیچھے بیٹھ گئے۔ راستے میں وہ فلم پر تنقید کرتے رہے مگر میں

چپ تھی۔ شاید اگر بولنے کی کوشش کرتی تو بھی نہ بول سکتی۔ میں ساری رات

رونی رہی۔ کتنے مگڑا ہوتے ہیں یہ مرد، ان کے نزدیک ایک دل کی کوئی

قیمت ہی نہیں ہوتی — رورو کر میں نے اپنا تکیہ بھگو دیا۔

آخر صبح ہو گئی — اور میری زندگی کا سب سے منحوس دن طلوع ہوا۔

جس روز میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔

بھیا کا مچ میں تھے، آپا کسی سہیلی کے ہاں چلی گئیں۔ امی اوپر تختیں بننا

میرے پاس تھا۔ دروازہ کھلا اور رفیق اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ اتنا سنجیدہ

تھا کہ کسی حد تک ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کچھ ٹھنکا۔ بالکل اسی طرح جس طرح

وہ بھیا کی علالت والی رات کو شرماسا گیا تھا۔

”ڈرا دھر رہیے، مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے!“

”کیا ہے؟“

”مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے!“

”آپ کو جو کچھ کہنا ہے، یہیں کہہ دیجئے!“ میں نے غصے سے کہا۔

”تو آپ نہیں سنیں گی؟“ وہ بولا۔

”کہہ جو رہی ہوں کہ آپ کو جو کچھ کہنا ہے، یہیں کہہ دیجئے!“

”اچھا — آپ کو میری باتیں ناگوار لگتی ہیں!“

”ناگوار لگتی ہیں۔ ناگوار لگتی ہیں! میں نے جھلا کر کہا۔ ”بھلا مجھے کسی کی باتیں

کیوں ناگوار معلوم ہوں، کوئی کچھ کہے، مجھے کیا؟“

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ گویا سوچتا تھا کہ اب کیا کہوں۔

”میں آپ کو ہمیشہ غلط سمجھتا رہا۔“

”مگر میں نے تو کبھی ایسا اشارہ نہیں کیا۔ جس سے آپ کو غلط فہمی ہوتی۔“

”واقعی آپ نے کوئی اشارہ نہیں کیا۔ مگر یہ میری حماقت تھی جو میں نے ایسا

سمجھا اور اب تک سمجھتا رہا۔ میں اب آپ کو کبھی تکلیف نہ دوں گا!“

”یہ آپ کی مرضی ہے، میں نے کب آپ سے التجا کی تھی۔“

اس نے عجیب نگاہوں سے میری جانب دیکھا گویا کہہ رہا ہو کہ مجھے تم

سے ایسی امید ہرگز نہ تھی۔ اس کے چہرے پر کرب تھا، بے چینی تھی۔

”بہت اچھا۔ آپ نے وقت سے پہلے بتا دیا کہ آپ کی نظروں میں میری

کیا وقعت ہے۔ کاش مجھے پہلے ہی معلوم ہو جاتا۔ اب جب سب کچھ ظاہر ہو گیا

ہے۔ ایک بات اور بتا دوں — وہ یہ کہ اس سے پہلے بھی اسی قسم کے حالات

میں مجھے ٹھکرایا جا چکا ہے۔ مجھے ٹھکانے والی آپ کوئی پہلی ہستی نہیں ہیں —

بڑی آپا

خدا حافظ

اُس نے اپنے سر کو جنبش دی۔ اُس کے لبوں پر ایک بھیانک سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میں نے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔ وہ چل دیا۔ سر جھکائے ہوئے۔ اس نے پردہ اٹھایا اور بغیر میری طرف دیکھے، کمرے سے باہر نکل گیا، پردہ ہل رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری قسمت پر ہمیشہ کے لئے پردہ پڑ گیا ہو۔ جی میں آیا کہ اُسے آواز دے کہ بلالوں مگر میری زبان نہ ہل سکی۔ حلق خشک ہو گیا۔ میں کوچ پر گر پڑی۔ جی چاہتا تھا کہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روؤں چلاؤں۔ مگر باوجود انتہائی کوشش کے ایک آنسو بھی نہ نکل سکا۔ میں نے اُسے ہمیشہ کے لئے کھو دیا تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا؟۔ آپا دوسرے ہفتے واپس چلی گئیں، اتنے دن ہو گئے اس واقعے کو، مگر پھر کبھی رفیق ہمارے ہاں نہیں آیا۔ خدا جانے بھیا سے کیا بہانہ کیا ہوگا۔ پھر ایک دن سنا کہ وہ کہیں چلا گیا نہ اُسکا کوئی خط آیا نہ کوئی خبر۔

میرے دل میں ایک پچھتاوا رہ گیا اور ساری عمر ہے کاغذ کاغذ کہ میں اس بات سن لیتی۔ جسے سننے کے لئے وہ اتنا بے تاب تھا۔ خدا جانے وہ اس روز محنت کا پیغام لے کر آیا تھا یا میری غلط فہمی دُور کرنا چاہتا تھا۔

پھر سال کے اندر اندر ہی آپا کی ہمارے ایک رشتہ دار سے شادی ہو گئی اب میں سوچا کرتی ہوں کہ میری اس تباہی کا باعث میری کمزوری تھی یا بڑا بڑا؟ اس سب سے آج تک حل نہ کر سکی مگر اُس کا وہ فقرہ کہ ”مجھے ٹھکرانے والا“ اسد بھلی ہستی نہیں ہیں۔“ مجھے مرتے دم تک یاد رہے گا۔

دو کنارے

میں نے دونوں بازو اُپر اٹھائے، پنجوں پر اُچھلا اور سر کے بل چھلانگ مادی۔ نھک ہوا کے جھونکوں میں سے گزرتا ہوا دھم سے ٹھنڈے پانی میں روا۔ میری انگلیاں ندی کی تہ سے جا لگیں۔ پھر اُچھلا اور پانی کی سطح پر آگیا۔ دھرا دھرا دیکھا۔ گلدستے کا کوئی پتہ نہ تھا۔ پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ میں پورے دور سے تیرنے لگا۔ ذرا سی دیر میں نہیں نے گلدستے کو دیکھ لیا جو کافی دُور تھا۔ پتھروں سے بچتا ہوا بڑی تیزی سے تیرتا جا رہا تھا۔ خوب لمبا سانس لے کر ایک غوطہ لگایا اور پھولوں کے بالکل پاس جا پہنچا۔ یکایک پانی گرنے کا شور سنا دیا۔ پھوار کے بادل اُٹھتے نظر آئے۔ آبشار نزدیک آگئی تھی۔ میں نے بے نہماشا تیرنا شروع کر دیا۔ اگر فوراً ہی گلدستہ نہ پکڑ لیا، تو آبشار میں پھولوں کی پتی پتی بکھر جائے گی۔ آخر ایک اور غوطے کے بعد میں نے گلدستے کو جا لیا اور شپ سے پکڑ لیا۔ بڑی حفاظت سے اُسے کنارے

ہمک مے آیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میں کتنی دُور چلا آیا تھا۔ ندی کے موڑ اور چیر
کے درختوں نے اس چٹان کو چھپا دیا تھا جہاں سے دوبارہ پھلانگ لگائی تھی
گول گول پتھروں کو پھلانگتا ہوا کنارے کے ساتھ ساتھ جارہا تھا، وہ چٹان
بھی نظر آگئی۔ حیران رہ گیا، اتنی بلندی سے کس طرح کود گیا تھا۔ دوبارہ گوشش
بھی کر دی تو ہمت نہ پڑے۔

پھر اس چٹان پر ایک سفید سادھبہ بھی نظر آنے لگا، جو بڑا ہوتا گیا۔
یہ پروین تھی۔ میں نے پھولوں کو پھر سے چُنا، بجلا ایسے پھولوں کو کیونکر ضائع
ہونے دیتا، مسکراتے ہوئے رنگ برنگے معطر پھول، کتنے پیارے۔ بالکل
پروین کی طرح!

چھوٹی پگڈنڈی کئی چکر لگا کر پہاڑ پر چڑھتی تھی، لیکن اتنی دیر کون
لگاتا۔ میں سیدھا چل دیا۔ بلہاتے ہوئے سبزے کو روندتا، خود رو پھولدار پوٹوں
اور جھاڑیوں کو پھلانگتا اور چڑھ رہا تھا۔ اب پروین اچھی طرح نظر آرہی تھی پہاڑ
کا چمکیلا سورج ابھی ابھی جنگلوں سے طلوع ہوا تھا۔ سرد ہوائیں عجیب سی
خوشبو پھیلا رہی تھیں۔ نیلا نیلا آسمان، اُبلے اُبلے بادل، لہراتی ہوئی ہڈیاں،
اور چٹان پر کھڑی ہوئی پروین، سنہرے بالوں اور گلابی چہرے والی —
جس کی لیٹس ہوا کے جھونکوں سے کھیل رہی تھیں۔

اور جب میں اس کے پاس پہنچ گیا تو وہ مسکرائی۔ میں نے گلدستہ
اسے واپس دیدیا۔

شکوے

ہم واپس گھر چل دیتے۔ ایسا عجیب اتفاق ہوا۔ صبح میں تیرنے کے لئے آیا اور پردہ پہن پھول چنتی ہوئی مل گئی۔

ہم دونوں چپ چاپ چل رہے تھے۔ پھر اس نے کہا کہ میں نے یونہی چند پھولوں کے لئے اتنی بلندی سے چھلانگ لگا دی۔ میں نے جواب دیا کہ جب تیرتے ہیں تو چھلانگیں بھی لگاتے ہیں۔
پھر دونوں چپ ہو گئے۔

میں نے ڈریسنگ گاؤن کی جیب سے سگریٹ نکالا پوچھا: "سگریٹ سگالوں۔"

وہ بولی "ہاں"

"سگریٹ پی لوں۔"

"ہاں!" — پھر خاموشی — میرا جی چاہتا تھا کہ یہ باتیں کرے۔

"یہ وادی کس قدر خوبصورت ہے۔ اُدے اُدے پہاڑوں کی قطاریں یوں لگ رہی ہیں جیسے سمندر کی لہریں ہوں اور جھلجھل کرتے ہوئے چٹنے۔ جیسے چاندی کے تار! ان سفید سفید بادلوں نے آسمان میں کیسے عجیب گنبد بنا رکھے ہیں۔ دیکھا؟"

"جی! " وہ بولی۔

اب ہم ایک موڑ سے گزر رہے تھے۔

اور وہ آبشار تو دیکھی ہی نہیں تم نے، کیسی دھندلی سی قوس قزح نے اسے محیط کر رکھا ہے، چاروں طرف پھوار پڑ رہی ہے۔ یہ پانی اُن چھیلی

چوڑیوں سے آ رہا ہے، وہ اُجلی اُجلی چوٹیاں جن پر برف جمی رہتی ہے۔ کبھی تم نے یہ پانی چکھا؟ ایسا ٹھنڈا اور شیریں ہوتا ہے کہ کیا بناؤں۔ اگر تم کہو تو کل وہاں چلیں؟“

”اچھا!“

اب ہم گھر کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ ان کی کوٹھی پہلے آتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اس مختصر سے وقفے میں بہت سی باتیں ہوں۔

”خوب! تو ہم گھر کے نزدیک پہنچ گئے۔ وہ سامنے صنوبر کا اونچا درخت نظر آ رہا ہے۔ آج کیا پروگرام ہے؟ دوپہر کے بعد سب سیر کو چلیں گے نا؟ نہیں؟ — آبا دو بندوقیں لائے ہیں۔ ایک میں لے چلوں گا۔ چھوٹی چھوٹی چڑیاؤں کا شکار کریں گے جو اُس جھنڈ کے پیچھے جھیل ہے۔ وہاں چلیں گے، وہاں ناشپاتیاں بھی ہیں اور سیب بھی شاید سڑا بری بھی ہو، تم کلیوں اور جنگلی پھولوں کے گلہ تے بنانا، میں تیار رہوں گا کہ کب وہ تمہارے ہاتھ سے گر کر نیچے بہتے ہوئے نالے میں جا پڑیں اور میں دھم سے چھلانگ لگا دوں۔“

”لیکن آج دوپہر کے بعد تو — آج ذرا وہ — مجھے کچھ پڑھنا تھا۔“

اب اُن کا گھر آ گیا تھا۔

میں نے جلدی سے کہا: ”اچھا لائیے جناب ہمارا گلہ ستہ واپس کر دیجئے۔“

اور پھول واپس لے لئے۔

وہ چلی گئی۔ میں کھڑا دیکھتا رہا۔

پھر ایک سرد شام کو میں لمبی سیر سے واپس آ رہا تھا۔ دن بھر کی دوڑ دھوڑ

سے بالکل تھکا ہوا، گلے میں کیمروہ بندوق، تھیلے اور زجانے کیا کیا الا بلا۔ گھر اب نزدیک تھا۔ صرف دو موڑ اور رہ گئے تھے۔ یکایک میری نگاہ چہرے کے درخت کی چوٹی پر گئی۔ جہاں بڑی روشنی ہو رہی تھی، لمبے لمبے نوکدار پتوں سے ایک بڑا چمکیلا تارا جھانک رہا تھا۔ میں وہیں رُک گیا اور اُسے دیکھنے لگا۔ پھر جکڑ کاٹ کر اوپر پہنچا۔ ہوا کے جھونکے تیز ہو گئے۔ اور خشکی بڑھ گئی۔ موڑ سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک اور تارا چمک بھی رہا تھا، اتنا ہی بڑا، اتنا ہی پیارا۔ پہلے تارے کے بالکل قریب۔

میں مسکراتا ہوا ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور ان دو تاروں کو دیکھنے لگا۔ وسیع آسمان میں جہاں لاتعداد ننھے ننھے تارے چمک رہے تھے۔ وہاں یہ دونوں روشن ستارے سب کو خیرہ کئے دیتے تھے، ایک دوسرے کے بالکل ساتھ ساتھ، جیسے ہاتھ پکڑے ہوئے ہوں اور فضا کی ظلمت میں دوش بدوش چل رہے ہوں۔ کتنی دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ سوچا کہ یہ تارے ضرور پروین کو دکھاؤں گا اور جب گھر پہنچا تو عجیب خبط مجھ پر سوار ہو گیا۔ ساری رات نہ سو سکا۔ ذرا ذرا سی دیر کے بعد اٹھتا اور باہر نکل کر دونوں تاروں کو دیکھتا کہ دونوں ساتھ ہی ہیں کہیں پچھڑ تو نہیں گئے۔ مگر وہ رات بھر ساتھ رہے۔ جب پچھلے پہر دھندلے ہوئے تب بھی اکٹھے، اور ساتھ ہی غائب ہو گئے۔

اگلی شام کو جب ہم سب سیر سے واپس آ رہے تھے تو میں نے پروین کو باتوں میں لگالیا۔ اور ہم دونوں پیچھے رہ گئے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں ہم اُسی موڑ پر پہنچے جہاں سڑک کے ایک طرف تو اونچا پہاڑ تھا اور ایک

طرف وادی تھی۔

بچے کہیں اکی ڈکی روشنی ٹٹا جاتی اور پھر اندھیرا ہو جاتا۔ نیا چاند آسمان میں تیر رہا تھا۔ چاروں طرف ہلکی ہلکی چاندنی پھیلی ہوئی تھی بالکل پھیکی سی۔

جہاں دوسرے تاروں کی چمک چاندنی میں ماند پڑ گئی تھی وہاں وہ دونوں تارے بالکل اسی طرح چمک رہے تھے، بلکہ چاند سے بھی زیادہ روشن تھے۔
”وہ تارے دیکھ رہی ہو؟“ میں نے اشارہ کر کے کہا۔

وہ لمبی لمبی پلکیں اٹھائے انہیں دیکھنے لگی۔ میں اُس کے جگمگانے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

”کیسے ساتھ ساتھ ہیں“ میں نے کہا۔

”اور رات بھر میں انہیں دیکھتا رہا۔ یہ یونہی اکٹھے سفر کرتے رہے، اور غروب بھی اکٹھے ہوئے۔ مجھے یہ ڈر رہا کہ کہیں بچھڑ نہ جائیں۔“

اور جب اس نے بڑی بڑی مسوکر کن آنکھوں سے مجھے دیکھا تو میں بے چین ہو گیا۔ نہ جانے ان نگاہوں میں کیا پیغام تھا؟ وہ کیا کہنا چاہتی تھیں؟ اس تلکے دوپٹے کے حاشیے میں وہ گلابی چہرہ ایک خوابیدہ پھول دکھائی دے رہا تھا جو ہوا کے جھونکوں سے ابھی ابھی کھلا ہو۔

ایوں لگتا تھا جیسے یہ سب کچھ ایک رنگین اور سُہانا خواب ہے۔ آسمان پر دُکنے ہوئے تارے یونہی نہیں جھلملاتے۔ ان کے بھی اشارے ہیں۔ رمزی ہیں۔ شبنم گل سے پیچھے پیچھے کیا کہہ جاتی ہے؟ چاند سمندر کی لہروں سے رات بھر باتیں کرتا رہتا ہے؟ کنول کے پھول ہوا سے کیا سرگوشیاں کرتے ہیں؟ یہ ایک راز ہے۔

جب ہم واپس آرہے تھے تو میں اپنی تاروں کا ذکر کر رہا تھا۔
میں نے کہا۔ ”کہتے ہیں کہ ان تاروں کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔“
”پتہ نہیں۔“ وہ سرد مہری سے بولی۔ ”ہونا ہوگا۔“
وہ ایک لحنت گہرا گئی جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے ڈر جائے۔ اس نے پھر
میری طرف نہیں دیکھا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ راستے میں بہت تھوڑی باتیں ہوئیں۔
دیر تک سوچتا رہا کہ اس فوری تبدیلی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے ؟

ہمیں پچھر دیکھے عرصہ ہو گیا تھا۔ پندرہ بیس میل دور نیچے ایک سینما تھا پہلے
ایک مرتبہ وہاں جا چکے تھے۔ طے ہوا کہ وہاں پچھر دیکھی جائے۔ بزرگ حضرات
میں سے چند ایک نے اختلاف کیا لیکن بعد میں وہ بھی مان گئے۔

کار میں میں آگے بیٹھا تھا اور پروین پچھلی سیٹ پر۔ جب ہم ایک انفرمیرے
جھنڈ میں سے گزر رہے تھے تو میں نے سامنے لگا ہوا شیٹ ترچھا کر دیا۔ اب
میں پروین کو دیکھ سکتا اور وہ مجھے۔ پتہ نہیں کار میں کیا باتیں ہوتی رہیں ؟ بس
میں ٹکٹلی باز آئے دیکھ رہا تھا اور وہ مجھے۔ لیکن دیکھتے دیکھتے نہ جانے وہ کیوں
چونک پڑتی اور جونگا ہیں نیچی کرتی تو میں تنگ آ جاتا۔ یہ معاً بالکل سمجھ میں نہ آیا۔
نیچے پہنچے۔ وہاں ایک رنگ برنگ طویل کارٹون دکھایا جا رہا تھا۔

اس میں سنو ڈائٹ ایک بڑی پیاری لڑکی تھی اور سات چھوٹے چھوٹے
مسخرے ہونے لگے۔ پروین میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ خوب مسکرا رہی تھی۔

میں نے آپا کے کان میں کچھ کہا۔ وہ بولیں۔ ”چپ۔“

دوبارہ کہا۔ وہ بولیں۔ ”ہشت۔“

پروین سے کہا۔ وہ چپ ہو گئی۔ میں نے پوچھا۔ ”کہدوں؟“

بولی۔ ”کہہ دیجئے!“

میں نے زور سے کہا۔ ”ایک سنووائٹ ہمارے ساتھ بھی ہے!“

سب پوچھنے لگے۔ ”کون؟“

میں نے پروین کی طرف اشارہ کر دیا۔ ایک قہقہہ پڑا اور وہ شرما گئی۔

”کس طرح بھلا؟“ کسی نے پوچھا۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ ”شکل و صورت بالکل ملتی جلتی ہے۔ بھولی بھالی

— اور —!“

آپا نے مجھے بُری طرح گھورا۔

جب ہم واپس آنے لگے تو پچھلی سیٹ پر بیٹھے کا موقع ملا۔

پروین کے ساتھ ایک ننھی مٹی بچی بیٹھی تھی۔ اس کے ریشم جیسے بالوں سے

بڑی اچھی خوشبو آرہی تھی اور ایک نیلا ربن نہار ہا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان

یہی گڑیا بیٹھی تھی۔

ننھی نکلی باندھے پروین کو دیکھ رہی تھی۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“ میں نے اُس کے کان میں پوچھا۔

”دیکھ رہی ہوں کہ آپا کتنی پیاری ہیں۔“ وہ بولی اور میں نے اُس کے

نہنے ہونٹ چوم لئے۔

سامنے بھاگتی ہوئی ٹہنیوں اور پتوں میں دہی دو جھیلے تارے جھانک رہے تھے۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی لیکن وہ دونوں اُسی طرح دما۔ رت تھے۔
”وہ دیکھو دو تارے!“

پردین ٹنگی باندھے دیکھ رہی تھی۔

”وہ بائیں طرف کا تارا تمہارا ہے اور دایاں میرا۔“ میں نے کہا۔ وہ میری بائیں طرف بیٹھی تھی۔

”جی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

کار کو گیراج میں چھوڑ کر ہم دونوں اُن کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ سہانی چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ ہم گلاب کے تختوں میں سے گزرے، جہاں بھول کلیاں، پتے سب سوئے پڑے تھے۔ پھر لمبے لمبے سایوں اور پتھروں سے لدی ہوئی ٹیلیوں میں سے گزرے۔ ہمیں ننھی ننھی کلیوں نے چھپ چھپ کر دکھا۔ تاروں کے جھرمٹ نے ہمیں اکٹھے چلتے دیکھا۔ چاند جو اونچے درختوں میں سے جھانک رہا تھا، ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگا اور چاندنی کئی گنا تیز ہو گئی۔
میں بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

”ایک بات ہے!“

”کیا؟“

”وہ یہ ہے کہ میں ایک عرصے سے چاہتا تھا کہ کہہ دوں۔“

”کہہ دیجئے۔“

اور پھر کہہ دینا ہوتا بھی اچھا ہے، بھلا چھپانے سے کیا فائدہ؟ بات دراصل یہ ہے۔ کہ وہ۔۔۔“

”ہاں ہاں کہئے۔۔۔!“ وہ مسکرانے لگی۔ میں گھبرا گیا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ مدت سے کہنا چاہتا ہوں کہ۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔“

”یہی کہ۔۔۔ یہی کہ یہ تارے بہت چمکتے ہیں اور پھر تارے بھی خُدا نے خوب بنائے ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو رات کو بڑا اندھیرا ہا کرے۔“

اب اُن کی کوٹھی بالکل نزدیک آگئی تھی۔ میں نے پھر ہمت کی۔ ایسے موقع بار بار نہیں آتے۔ جو کچھ کہنا ہے اب بھی کہہ دو۔ کیا بُزدلی دکھا رہے ہو۔ میں نے کلا صاف کیا اور بولا۔

”نہیں تاروں کی بات نہیں ہے۔ بات کچھ اور ہے، مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم بُرا نہ مان جاؤ۔ لیکن اب کوئی ڈر نہیں، تمہیں بُرا لگتا ہے تو لگا کرے۔ میں ضرور کہوں گا۔۔۔“

”ہاں ہاں کہہ دیجئے۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔

”یہی کہ مجھے اتنے دنوں سے تم سے۔۔۔ یعنی مجھے سچ پچ تم سے۔۔۔ یعنی۔۔۔“

”ہاں ہاں!“

”مجھے تم سے۔ ایک شکایت ہے، یہی کہ تم اتنے ساہلے لباس کیوں پہنتی ہو جب کہ تمہارے پاس ایسے اچھے لباس ہیں۔“

وہ ہنس دی۔ اب ہم برآمدے میں پہنچ گئے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں ہرگز اُسے نہیں بنا سکتا۔

کیا نو وہ مسکرا رہی تھی اور کیا بے چین سی ہو گئی۔

وہ تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ یہ کیا اسرار ہے؟۔ اس رویے میں کیا راز پوشیدہ ہے۔ جسے میں سمجھ نہیں سکتا۔ آخر یہ بے رُخی کیا ظاہر کرتی ہے؟ میرے ساتھ یہ دفعۂ رنجیدہ کیوں ہو جاتی ہے؟ کس قدر پیچیدہ ہے یہ معما؟

اور یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا، ہر دفعہ یہی ہوتا ہے، مسکراتے ہوئے چہرے پر یکلخت خوف کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ کہیں اُسے مجھ سے نفرت تو نہیں؟ نہیں نہیں نفرت نہیں ہو سکتی۔ اگر ہوتی تو یہ بتا دیتی، مگر بتاتی کس طرح؟ کیونکہ کہہ دے کہ مجھے آپ اچھے نہیں لگتے، مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ شاید یہ مجھے صرف ایک رفیق سمجھتی ہے، ایک مخلص رفیق۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں، اپنی محبت کے قابل نہیں سمجھتی۔ میں ساری رات یہی سوچتا رہا۔ کئی بار اٹھ اٹھ کر میں نے تاروں کو دیکھا کہ کہیں پچھتر نہیں گئے۔ گردہ بدستور اکٹھے تھے۔ دل کو اطمینان سا ہو گیا۔

دوسرے روز دیکھا کہ سامنے کی کوٹھی میں کچھ مزدور کام کر رہے ہیں۔ چٹان پر چڑھ کر دیکھا تو ٹینس کا میدان ٹھیک کیا جا رہا تھا۔ لائنیں لگائی جا رہی تھیں، میری رال ٹیک پڑی۔ مدت سے ٹینس کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ جی میں آیا کہ ان لوگوں سے واقفیت پیدا کی جائے۔ ہماری اور ان کی کوٹھی کے درمیان ایک چوڑا

نالا بہتا تھا۔ جس میں میں روز نہایا کرتا تھا۔ اس کا پل آدھ میل پرے تھا۔ زکروس نے بتایا کہ سامنے کوئی انگریز گنبرہ رہتا ہے۔ اُن کی ایک لڑکی ہر روز تیرنے آیا کرتی ہے۔ مجھے یاد آگیا۔ ایک انگریز لڑکی کو میں ہر روز نالے کے دوسرے کنارے پر تیرنے دیکھتا تھا، لیکن باتیں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

چند دنوں تک ہماری واقفیت ہو گئی۔ اُس نے میرے تیرنے کی تعریف کی اور میں نے اُس کی شکل کی اور لباس کی۔ ہم صبح اکٹھے تیرتے، باتیں کرتے۔ وہ کہا کرتی۔ آپ بہت اچھا تیرتے ہیں۔ آپ کا جسم کتنا موزوں ہے بالکل سپورٹسین جیسا۔ کبھی ہمارے ہاں بھی آئیے۔ مئی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ میں عموماً ان سے آپ کا ذکر کیا کرتی ہوں۔ ہم لوگ تنہائی سے تنگ آ جاتے ہیں۔ آبا باہر گئے ہوئے ہیں۔ مئی کسی سہیلی سے ملنے تین چار میل دور چلی جاتی ہیں۔ میں اکیلی گھبراتی ہوں۔ ہمارے ہاں پنگ پانگ بھی ہے اور ٹینس بھی۔ میں مودی کیمبرے سے تصویر اتار کرتی ہوں۔ ہمارے ہاں رنگ برنگے خوبصورت پرندوں سے پتھرے بھرے ہوئے ہیں۔

لیکن میں نال مٹول کر جاتا۔

ایک دن پردگرام بنا کہ دوپہر کو میرے تیرنے کی فلم اتاری جائے، وہ اپنا مودی کیمبرہ ساٹھ لے آئی۔ میں نے ایک اونچے پتھر سے چھلانگ لگائی اور تیرتا ہوا دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔

”مجھے آپ اُس پتھر پر لے چلے۔“ وہ ایک پتھر کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ جو نالے کے درمیان میں تھا۔

”ننھی بولی۔“ تو اب آپ ہمارے ساتھ ہی رہا کریں گی نا؟“
 ”ہمیشہ تو رہتی ہوں تمہارے ساتھ۔“ ننھی گڑیا!۔
 ”اؤں ہوں۔ میں پڑھتی ہوں آپ ہمارے ساتھ چلیں گی۔ ہماری آپا
 بن کر؟“

پردین کا دکنا ہوا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔
 ”بتاؤ نا آپا!“ ننھی چلنے لگی۔
 ”دیکھو نہ بہت کیسی رنگ برنگی کلیاں ہیں۔“ پردین بولی۔
 ”نہیں نہیں کلیاں نہیں چاہئیں، آپ بتائیے کہ چلیں گی ہمارے ساتھ
 یا نہیں؟“

”ارے! وہ دیکھو کیسی اچھی تتلی اڑی جا رہی ہے، پکڑ لو تو جانیں۔“
 اور جب ننھی بیٹھی رہی تو پردین خود تتلی کے پیچھے بھاگ پڑی۔
 شام کو سیر سے واپس آتے ہوئے مجھے موقع مل گیا اور میں نے پردین کو
 اپنے ساتھ ٹھہرا لیا۔ ”آؤ جھیل تک چلیں!“ میں نے کہا۔
 ”دیر تو نہ ہو جائے گی؟“
 ”نہیں!“

ہم دونوں ایک چھوٹی سی گڈنڈی پر چل رہے تھے۔
 اُدے اُدے پہاڑوں کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔ پہاڑ کی
 چوٹی پر چیر کے درختوں کی قطاریوں چمک رہی تھی جیسے سنہری سجاوٹ لگی ہوئی
 ہو، آسمان شفق کی سُرخ سی جگمگ رہا تھا۔ پردوں کے غول کے غول اُڑے

جا رہے تھے۔

ہم دونوں چپ چاپ چل رہے تھے۔ معط ہواؤں کے جھونکے تیز ہوتے گئے اور ہم اس موڑ تک پہنچ گئے۔ میری نگاہیں آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔ دونوں تارے ابھی ابھی طلوع ہوئے تھے۔ دل مسرت سے ہنسنے لگا۔ میں نے پروین کو دیکھا اور نگاہوں میں اتنا کچھ کہہ گیا کہ زبانی نہ کہہ سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج اس سے ساری بات پوچھوں گا۔ آج اس معنی کو حل کر کے جاؤں گا۔ تمہیں یہ تارے اچھے لگتے ہیں نا؟ میں نے پوچھا۔

ہاں! بہت! " وہ یولی۔

"ارے!" میں وہیں رُک گیا۔ "تارا ٹوٹا پروین!"

ان میں سے ایک تارا ٹوٹا اور نورانی لکیر بنانا ہوا غائب ہو گیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے پروین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی سہم گئی تھی۔

"کون سا تارا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کون سا تھا!"

بہتر ایا د کرنے کی کوشش کی مگر پتہ نہ چلا کہ کون سا تارا ٹوٹا تھا۔

چہرے کے درختوں کی نوکدار چوٹیوں پر صرف ایک روشن تارا جگمگا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی چمک بھی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔

جب ہم واپس آ رہے تھے تو جنگل میں سناٹا تھا۔

وہ حیرت انگیز جگہ میں پہلے نظر انداز کر دیا کرتا آہستہ آہستہ بڑھتا گیا، اور مجھے نہ جانتے کیوں یقین سا ہو گیا کہ پروین کو مجھ سے نفرت تھی، شروع سے

ہی نفرت تھی اور میں ہمیشہ اُسے غلط سمجھتا رہا!

اوپنے اوپنے درختوں سے گھری ہوئی جھیلوں کی سطح پر میں نے اُداسی دیکھی۔ درختوں کے کانپتے ہوئے سائے دیکھے، پتوں کی سرسراہٹ میں سرداہیں سنیں۔ میں نے سوچا کہ پانی کی یہ سطح میری روح کی طرح ہے جس پر تاریکیاں منعکس ہیں جس پر دہشت ناک تاریکی چھائی جا رہی ہے۔ میں نے ہنر تھرائی ہوئی ٹہنیاں دیکھیں بڑے بڑے اُداس پھول دیکھے جو ڈنٹھلوں پر جھکے ہوئے تھے۔

یوں محسوس ہوتا جیسے دنیا نہایت ٹھگین جگہ ہے۔ یہاں مسرت کی آہنی سی رمت بھی تو نہیں، آہیں ہیں، سسکیاں ہیں، رنج ہیں، پھیکے پھیکے خوابوں میں وحشت ہے۔ میں چرچڑا ہو گیا۔ ایک ایک کر کے سارے مشغلے ختم ہو گئے۔ رات کو کھڑکی میں دوروشنیاں نظر آتیں، ایک تو وہی تنہا تارا اور دوسری روشنی اُسی لڑکی لوسی کی کوشی سے آئی۔

میں بیٹھا تصویر بنا رہا تھا۔ طرح طرح کے رنگ سامنے رکھے تھے۔ دھڑام سے دروازہ کھلا اور ننھا اندر دوڑتا ہوا آیا۔ تجھے پیچھے اور بچتے تھے۔ ہاتھ میں کرکٹ کا بلا اور گیند تھی۔

”آہا، تصویر بن رہی ہے، کیسی رنگ رنگی تصویر ہے، یہ کہاں کی ہے؟“
”کہیں کی بھی ہو۔ تم جا کر کھیلو۔!“

”ہم تو یہ تصویر لیں گے، ابھی نہیں۔ جب یہ بن جائے گی تب“
”اسی وقت دوڑ جاؤ۔ ورنہ پٹ جاؤ گے۔“

”اچھا! آپ یہ تصویر ہمیں دے دیں گے نا؟“

”نہیں! ہرگز نہیں!“ میں نے غصے سے کہا۔

”اچھا تو ہمارے ساتھ کرکٹ ہی کھیل لیجئے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ بولنگ

سکھائیں گے۔“

”اس وقت نہیں! پھر کبھی سہی!!“

”آج تو ہم آپ کو ضرور لے کر جائیں گے۔“

”میں آج ہرگز نہیں کھیلوں گا۔“

”اچھا اگر نہیں کھیلتے تو یہ تصویر ہی۔“

”شیطانو!“ میں چلا کر بولا۔ ”تم نے مجھے کیا سمجھا ہے، میں تمہارا ڈرل ماسٹر

ہوں یا انگلیا دوست — لوریہ رہی تصویر۔“ میں نے تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

دیر تک بیٹھا بیچ و ناب کھایا کیا، پھر کوٹ اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ نوکر

کو آواز دی کہ موٹر سائیکل لے آئے۔ دو نوکر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر ایک ہنس اور دوسرے کے کان میں کچھ کہا۔ اُس نے بھی دانست نکال دیئے۔

”جیسا ہے؟“ میں نے پوچھا

”کچھ نہیں۔“

”تم اس سے کیا کہہ رہے تھے؟“

”کچھ بھی نہیں۔“

شگوفے

” تو تمہیں بھی ہنسی سوجھتی ہے ، صاف صاف بتاؤ کیا بات تھی۔“
” میں یہ کہہ رہا تھا کہ موٹر سائیکل تو پچھلے ہفتے آپ ہی نے مرمت کے لئے بھیجی تھی۔“

دیر تک کمرے میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ننھی کی آواز نے چونکا دیا۔ اس کا انتہا سنا سنا ہوا تھا میرے چہرے کو چھو رہا تھا۔

” بھیا !“

” میں چونک پڑا۔“ ” ایں ؟“

” بھیا کیا سوچ رہے ہیں آپ ؟“

” کچھ نہیں !“

” آئیے ! آپا پروین کے ہاں چلیں !“

” نہیں ! وہاں نہیں جائیں گے۔“

” تو پھر مجھے اپنے ساتھ سیر کو لے چلتے۔“

” نہیں ! اور کسی کے ساتھ چلی جاؤ۔ مجھے کام ہے !“

” کوئی بھی کام نہیں آپ کو ، آپ یونہی رات تک یہاں بیٹھے رہیں !“

” اب جاؤ ! کہا نا کرتے ہیں بڑوں کا !“

” نہیں ! ہم تو سیر کو چلیں گے اور وہاں سے آپا پروین کے ہاں !“

وہ چل گئی۔

میں نے اُسے جھڑک کر کہا : ” ننھی شور نہ کرو۔“

وہ چپ رہی۔ اس نے بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ مصمم

آنکھیں دھندلی ہو گئیں اور دو بڑے بڑے آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ وہ پیچھے سے باہر جانے لگی۔ میں نے دوڑ کر پکڑ لیا اور گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا۔

کتنی مرتبہ امی نے بھی ٹوکا کہ یہ کیا سارا دن کمرے میں بند رہتے ہو، کیا تو صبح سے شام تک قہقہے لگاتے پھرتے اور کیا اب ہر وقت کا بسورنا رہ گیا ہے۔

پر دین کے ہاں سے ہر تیسرے چوتھے روز شکایت آتی کہ میں دہاں نہیں جاتا۔ ایک روز آیا بولے، 'شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں، سامنے کے پہاڑ پر ایک ڈاکٹر رہتے ہیں انہیں دکھائیں گے۔ نالے کے اس کنارے سے دیکھا کوسٹی اپنے باغیچے میں پھر رہی تھی، سبز رنگ کا گاؤں پینے، کچھ دیر کھڑا دیکھا رہا۔ پھر نہ جانے کیا دل میں آیا، جھٹ سے تھک کی سبز جرسی پہنی، بال سنوارے اور سیدھا چل دیا پل کی طرف۔ کوسٹی کی کوٹھی اور ہمارے درمیان جو نالا تھا اس کا پل۔

میں نے جلدی سے پل عبور کیا۔ کوسٹی نے مجھے دیکھا۔ دوڑی دوڑی آئی۔ اس کا دکتا ہوا چہرہ اور بھی دکھنے لگا۔ میری شوخ جرسی کہ دیکھا اور بڑی تعریف کی۔ پھر میرے بازوؤں کو دیکھتی رہی۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دیر تک لئے رکھا۔ اس کی امی کہیں باہر تھیں۔ مجھے کوٹھی کا کونا کونا دکھایا، پرندے دکھائے، پھر صوفے پر بٹھا کر اپنا البم دکھانے لگی۔ وہ میرا سہارا لئے صوفے کے بازو پر بیٹھی تھی۔ اس کی معطر زلفیں میرے چہرے کو چھو رہی

تھیں۔ ہم خوب تہقے لکاتے رہے۔

جب میں ٹوٹا تو مسرور تھا، مطمئن تھا، سیٹی بجاتا ہوا آرہا تھا۔ میں نے وہ پل اُچھلتے کودتے عبور کیا۔

اس کے بعد ہم اکٹھے سیر پر جاتے، تصویریں اُتارتے، میرا زیادہ دقت اُن کے ہاں گزرنے لگا۔ پروین جیسے غائب ہو گئی۔ کیا ہوا جو کبھی کبھار آنا سامنا ہو گیا۔ روکھا پھیکا سلام ہوا اور بس!

اب میں پھر سنس مکھ ہو گیا تھا۔ چڑچڑاپن جاتا رہا تھا۔

ایک دن میں اور ٹوٹی دونوں سیر سے واپس آرہے تھے۔ اچھا خاصا اندھیرا ہو چلا تھا۔ ہم اُسی موڑ پر پہنچے۔ میری نگاہیں آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔ چیڑ کے درختوں پر ایک تنہا تارا چمک رہا تھا۔

ہم دونوں اُسی پتھر پر بیٹھ گئے، جہاں کبھی میں اور پروین بیٹھتے تھے۔ اُن لمحات میں میں نے اپنے آپ کو کس قدر تنہا محسوس کیا، وہ کونسی سُلگتی ہوئی چنگاریاں تھیں جو بھڑک اُٹھیں۔ میرا جی بھر آیا۔ ٹوٹی شاید کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن میں کچھ نہ سُن سکا۔ اس تنہا تارے کو دیکھتا رہا۔

دن گزرتے گئے اور آخر وہ دن آگیا، جب ہمیں واپس جانا تھا۔ آبا کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں، یہ اکالچ بھی کھلنے والا تھا۔ ہم سب واپس جا رہے تھے۔ میرا جی تو زچا ہوتا تھا کہ پروین کے ہاں جاؤں لیکن آپا کی خستہ لگا ہوں نے مجبور کر دیا۔ پروین کے آبا اور اتی بے زنی سے

ملے۔ نہ انہوں نے خود خط لکھنے کا وعدہ کیا اور نہ مجھے خط لکھنے کی تاکید کی۔
 پردین کی انا اپنے وطن جا رہی تھی۔ سٹیشن تک بس کا اور ہمارا
 ساتھ تھا۔ پہلی کاریں سب جا چکے تھے۔ دوسری میں سامان تھا اور میں اور انا۔
 سب سے آخر میں پردین سے ملنے اس کے کمرے میں ڈرتے ڈرتے
 گیا جیسے مجھے وہاں جانے کا کوئی حق نہ تھا۔

”خدا حافظ پردین!“ میں سچکے سے بولا۔
 ”خدا حافظ!“ اس نے سرد مہری سے کہا اور کھڑکی سے سفید سفید
 برنائی چوٹیوں کو دیکھنے لگی۔

میں چند لمحے اور بٹھرا، شاید پردین کچھ کہے لیکن وہ چپ رہی اور
 میں چلا آیا۔ ذرا سی دیر میں ہم واپس جا رہے تھے۔ کار فرائے بھرتی جا رہی
 تھی۔ سامنے پیڑ۔ کدو درخت، اودی اودی پہاڑیاں، رنگ برنگے کنبے،
 چمکیلی ندیاں۔ سب اڑے جا رہے تھے۔

سوچتے سوچتے میں نے انا سے پوچھا۔ ”ایک بات بتاؤ گی؟“

”کیا ہے؟“

”انا تم بہت اچھی ہو،“ اب تم چلی جاؤ گی پھر نہ جانے کب تمہاری
 زیارت ہو۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“ وہ خشکی سے بولی۔

”یہی کہ میں کیسا ہوں؟“

”اچھے بھلے ہو!“

تنگرفت

اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ میں جھجک کر پیچھے ہٹ گیا، لیکن پھر رکتا ہوا آگے بڑھا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس لطیف بوجھ کو سنبھال لیا۔ اُس نے ایک بازو میری گردن میں ڈال لیا اور دوسرے سے پانی کے پھینٹے اڑانے لگی۔

”نہیں یہ پھتر تو اچھا نہیں — وہ ٹھیک رہے گا۔“ اُس نے ایک دُور کے پھتر کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہاں روشنی بھی تیز نہیں ہے اور وہاں سے تصویر بھی اچھی آئے گی۔“

میں نے رُخ بدل دیا اور ادھر چلنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں بولی۔

”مجھے ایسے لڑکے بہت اچھے لگتے ہیں، آپ جیسے بے پرواہ اور خوش باش لیکن اتنی بے پروائی بھی کس کام کی۔“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا لیکن میں تیزی سے پھتر تک پہنچا اور جلدی سے اُسے اُتار دیا۔ وہ خاموش ہو گئی، لیکن جلد ہی سنبھل گئی اور مسکرانے لگی۔ اس کے بعد دیر تک فلم اُتارتی رہی۔

ایک صبح کہیں سیر سے واپس آ رہا تھا۔ باغ سے گزرتے ہوئے رُک گیا۔ پروین پھولوں کا گلہ سستہ بنا رہی تھی اور ننھی ساتھ بیٹھی تھی۔ جی میں آیا کہ ان کی باتیں سنوں۔ آخر کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ میں دبے پاؤں پردوں کی آڑ میں بالکل اُن کے نزدیک جا کھڑا ہوا۔

”تو پھر پر دین کو مجھ سے نفرت کیوں تھی؟ یعنی میں اُسے کیوں - بُرا لگتا تھا؟“

”مجھے کچھ پتہ نہیں۔!“

”تمہیں سب پتہ ہے۔ فقط یہ بنا دو کہ اس نفرت کی کیا وجہ تھی۔ اتنی کوششوں کے باوجود بھی اس کے پتھر جیسے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ہمیشہ اجنبی ہی رہی۔ آخر کیوں؟“
میں غمتیں کرنے لگا۔

”سنا ہی چاہتے ہو تو لوٹن لو۔ تم اسے محبت کہتے ہو، یہ خود غرضی ہے یا محبت، تم جیسا خود غرض تو کہیں نہ ہو گا۔ تمہیں کبھی بھی اس کا خیال نہ تھا۔“

”نہیں نہیں — یہ نہ کہو۔!“

”کیوں نہ کہوں؟ تم ذرا سی دلچسپی جتا کر یہ چاہتے تھے کہ وہ تمہیں پوسنے لگے۔ تم نے اُسے دیا کیا تھا جو بدلے میں اتنا کچھ مانگتے تھے۔ کبھی اپنے رُیتے پر بھی غور کیا۔ تم نے اُسے کس قدر ستایا ہے۔ تم نے اُسے کتنے رنج پہنچائے ہیں۔“

میں پاگلوں کی طرح اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

”آج سے دو سال پہلے ایسے ہی دن تھے۔ ہم گرمیوں میں یہاں آئے ہوئے تھے۔ پروین یہاں مینا کی طرح چمکتی تھی، کتنی چیخلی تھی، کتنی ہنس مکھ، سب اس کی شوخیوں سے پناہ مانگتے تھے۔ اس کا منگیترا بھی

”یہیں تھا۔!“

”منکیتر۔؟“

”ہاں! بیگم کا بھتیجا یا بھانجا، عجیب سالڑکا تھا۔ ایسا بانٹونی کہ صبح سے شام تک بولتا رہتا۔ بچپن سے رشتہ طے ہوا تھا۔ پروین نے ہوش سنبھال کر صرف اُسے ہی دیکھا تھا!“

”وہ لڑکا کیسا تھا؟ میرا مطلب ہے شکل صورت۔“ میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”یونہی معنی سا تھا، خاص بُرا بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کا منکیتر تھا۔ وہ ہر وقت خوش رہتی تھی، کتنی بھولی سی تو ہے، پھر اس کی زندگی میں بڑا منحوس دن آیا۔۔۔۔۔ وہ لڑکا کہیں چلا گیا اور پھر کبھی نہ لوٹا۔ خبر آئی کہ اُس نے کسی نہایت مالدار لڑکی سے شادی کر لی۔ دراصل اُسے پروین کے آبا کی جائداد سے دلچسپی تھی۔ پروین کا کوئی خیال نہ تھا۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے اس لڑکی کو کبھی خوش نہیں دیکھا۔ سدا غمگین رہتی ہے۔ مسکراتی ہے تو ٹھنڈا سانس بھر کر، اس کی ہنسی میں آنسو چھپے ہیں۔ ایک شوخ بتلی کی جگہ اب سنجیدہ اور افسردہ پروین رہ گئی ہے۔ اس کے نازک دل کو اس صدمے سے ایسی ٹھیس لگی کہ وہ کبھی سنبھل نہ سکی۔ اس کے دماغ میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ سب کے سب اس سے نفرت کرتے ہیں اور ایک ایک کر کے سب اُسے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اور یہ اکیلی رہ جائے گی اور یہ تمہیں کتنا اچھا سمجھتی تھی، اس کا اندازہ شاید

تم نہ کر سکو۔ مجھ سے تمہاری باتیں کیا کرتی۔ تمہاری خوبیاں، تمہارے خلوص جس دن تمہیں دیکھ نہ پاتی، اُسے چین نہ آتا۔

اسے یہی اندیشہ تھا کہ کہیں تم بھی نہ اُسے چھوڑ کر چلے جاؤ۔ چنانچہ تم نے یہی کیا۔ تم نے اس کے رہے ہے سہارے کو بھی چھین لیا۔ وہ بے چاری ہمیشہ جھجکتی رہی۔ اسے تمہاری باتوں پر اعتبار تھا، لیکن وہ جھجکتی تھی۔ اور تم ایسے خود غرض نکلے کہ اُس کی ذرا پروا نہ کی اور آخری دنوں میں جب تم نے اُس سے بولنا چھوڑ دیا تو وہ بہت اُداس رہنے لگی۔ جب تم نوستی کی کوکھی۔“

اُس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ میں کھوئی کھوئی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ کوئی میرے دل کو موسس رہا تھا۔

جب میں اس بھیانک خواب سے چونکا تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ فضا میں ماتم سا تھا۔ ہوا کے اداس جھونکے سائیں ساتیں کر رہے تھے۔

میرے سامنے چیڑ کے درخت، پتھروں کے ڈھیر، پہاڑیاں سب اڑے جا رہے تھے۔ کار فرائے بھرتی جا رہی تھی۔

میں مہتیلی پر ٹھوڑی رکھ کر شفق دیکھنے لگا۔ درختوں کے جھنڈ پر ایک گلابی بدلی کے پاس ایک چکیلا تارا جگمگا رہا تھا۔

میں دُھندلی نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُسی تنہا تارے کو! میں پھر بھی نہ سمجھ سکا کہ کون سا تارا ٹوٹا تھا!

نسرین

عید کے دن صبح صبح مقبول ملے۔ باچیں بھلی ہوئی، کلتے پر کلتے چڑھا ہوا۔ مارے خوشی کے منہ سے بات ہی نہ نکلتی تھی۔ پوچھا کہ کہاں بندھتے ہو آج کل؟ یہ اتنے گول مٹول سے کیوں ہو گئے؟ آخر کیا ارادہ ہے؟ جواب نثار، بس مسکرا رہے ہیں، بے تحاشا ہنس رہے ہیں۔ آخر تنگ آکر میں بھی ہنس پڑا اور کرتا بھی کیا۔

ہم دونوں برسوں "ہم تھپیڑ دھمکتے" رہ چکے تھے۔ دسویں جماعت کے بعد یہ اچانک کہیں فرار ہو گئے۔ پھر عرصہ تک لاپتہ رہے، اور اب اتنے دنوں کے بعد یلکھت مل گئے۔

مقبول پہلے سے لٹک گئے تھے۔ توند بھی طلوع ہو رہی تھی، چہرہ بھی دائرے کی شکل بنا رہا تھا۔ بڑے معتبر سے لگتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کہیں دور جنگلوں میں بزنس کرتے ہیں۔ اب ہنسنے کی میری باری تھی۔ غرب ہنسنا، تو کیا بزنس کرتے ہو اور جنگلوں میں، ہو گا کوئی درندہ

کایا چرندوں کا۔ لاسول دلاقوہ، بھلے آدمی یہی کام رہ گیا تھا دُنیا میں کیا؟
 پھر بولے "میری شادی ہو رہی ہے۔" اور میں ان سے چمٹ گیا۔ کس
 سے ہو رہی ہے۔ کب ہو رہی ہے؟ کیوں ہو رہی ہے؟
 شرما شرما کر بتایا کہ عزیزوں ہی میں ہو رہی ہے اور یہ اسے جانتے بھی
 ہیں۔

پوچھا۔ "کیسی ہیں۔؟"
 وہ سر جھکا کر بولے "اچھی ہیں۔؟"
 میں نے چل کر کہا۔ یوں بات نہیں بنے گی۔ میں اُن کی صحت کے
 بارے میں نہیں پوچھ رہا جو کہہ دیا کہ اچھی ہیں۔ ان پر تفصیلاً روشنی ڈالو۔
 اچھی طرح مکمل طور پر واضح کرو۔

پھر انہوں نے اپنی رام کہانی سُنائی کہ اُسے وحشیوں اور بیوقوفوں کی طرح
 چاہتے تھے اور چاہتے کیا تھے، خدا جانے کب سے چاہتے آرہے تھے۔ اُن
 کی دلی تمنا یہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اسے رفیقہ جیانت بنائیں چنانچہ بڑی مشکلوں
 کے بعد اب یہ حسرت پوری ہو رہی تھی۔

"جنگل بڑے بھیانک اور سنسان ہیں۔ اگر مجھے یہ خط نہ ہوتا تو کبھی کا
 چھوڑ چھاڑ کر بھاگ آتا۔ اتنے بڑے بھائیں بھائیں کرتے ہوئے بنگلے میں
 تو مارے ہول کے پاگل ہو جاتا۔ لیکن بس یہی اُمید تھی۔ جس نے ہمت
 بندھائے رکھی اور اب جنگل میں منگل ہو جائے گا۔ وہی ویران بنگلہ بھرا بھرا
 لگے گا۔"

”تب تو وہ بڑی خواہد رت ہوا گی۔“

”ہاں کچھ ہیں ہی۔ بس جیسی بھی ہیں۔ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ بہت ہی اچھی۔“

”یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ بس اچھی لگتی ہیں۔ بھلا انہیں بھی تمہارا خیال ہے کچھ؟“

”اس سے مجھے کیا؟ ہو یا نہ ہو۔ کیا اتنا کافی نہیں کہ میں انہیں اس قدر عزیز سمجھتا ہوں۔ پھر انہیں میرا خیال کیونکر نہ ہوگا؟“

”میں اس بھولے پن پر مُسکرا دیا۔ کتنا سیدھا سادہ ہے یہ؟ واقعی جیسی لڑکی بھی ہوئی اس کے ساتھ خوش رہے گی۔“

اس کے بعد دیر تک مقبول اپنی منسوبہ کی باتیں سناتے رہے۔ پھر انھوں نے اپنے مستقبل کے متعلق طرح طرح کے پروگرام بتائے۔

”ان کا نام کیا ہے؟“

”نسرین!“

”میں چونک پڑا۔“ نسرین؟“

”ہاں، ہاں، نسرین تمہارے گھر آیا کرتی تھی۔ شاید تم نے اُسے دیکھا بھی ہو۔“

اور میں نے اُسے دیکھا تھا۔ کتنی ہی مرتبہ۔

میں اُسے بہت دنوں سے جانتا تھا۔ کتنی دفعہ اس سے باتیں کیں۔

مدتوں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ مقبول اُنھ کو چلے گئے۔ میرے دل

میں اُلجھن سی پیدا ہو گئی تھی۔ نسرین جا رہی ہے مقبول کے ساتھ۔ !
یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے زندگی سے کچھ نکل گیا ہو۔ بڑی دیر تک
سوچتا رہا۔ نہ جانے وہ من موہنی بھولی بھالی لڑکی کیوں رہ رہ کر یاد آ رہی
تھی۔ کوئی خاص بات بھی تو نہ تھی۔ اس سے ہمیشہ میں اجنبیوں کی طرح
پیش آیا۔ اور اب تو وہ مقبول کے ساتھ جا رہی ہے جو اُسے پوچتا ہے۔
اس کی ناز برداریاں کرے گا۔ مقبول کی زندگی میں خوشگوار تبدیلیاں آجائیں
گی۔ جنگل میں منگل ہو جائے گا۔

میں آپا کے کمرے میں چلا آیا۔ کہا اپنے الیم دکھاؤ۔ ذرا سی دیر میں
اُکٹا گیا۔ پھر تاش کھیلنے بیٹھے، لگاتار مارے گیا۔ آپا میری پارٹنر تھیں۔ انھوں
نے پتے میز پر مارے اور بولیں۔ "نہ جانے کیا سوچ رہا ہے۔ کھیل میں تو
دھیان ہی نہیں ہے۔ اب اس سے زیادہ نہیں مارا جاتا۔" وہاں سے سیدھا
بچوں میں جاشال ہوا۔ ان کے ساتھ کھیلتا رہا۔ لیکن جلد ہی اُکٹا گیا۔ پھر سوچنے
لگا کہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو یوں بہلانے سے کیا فائدہ؟ مان کیوں نہیں لیتا
کہ اس خبر سے تجھے افسوس ہو رہا ہے۔

میں باہر باغیچے میں چلا آیا۔ ایک آرام کرسی پر لیٹ گیا۔
مجھ پر جیسے غنودگی طاری ہو گئی۔ تصور میں جیسے سچ سچ سامنے ایک
چہرہ آگیا۔ گلابی دُمکا ہوا چہرہ جس کے دونوں طرف گھنگھریالے بال لہرا رہے
تھے۔ لمبی لمبی پلکیں اٹھیں اور دو نشیلی آنکھیں مجھے دیکھنے لگیں۔ آنکھیں
جن میں بے انتہا ملاحت تھی۔ پھر گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ننھے ننھے ہونٹ

شکوہ

لرزتے گئے۔ جیسے کچھ کہہ دیں گے۔ لیکن انہوں نے کچھ نہ کہا۔ بس لرز کر رہ گئے۔

مجھے نسرین کی ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ ایک ایک کر کے ساری تصویریں سامنے آ گئیں۔ کئی سال پہلے کی بھی، جب میں نے اُسے پہلی مرتبہ دیکھا۔!

اس روز کرکٹ کے لئے جاتے وقت مجھے یونہی خیال آ گیا کہ ذرا خوشبو لگاتے چلیں۔ گیند پھینکتے وقت اگر کبھی کبھار خوشبو کی لپٹ آجائے تو بکام محسوس نہیں ہوتی۔

میں نے بتو کو آپا کے کمرے میں بھیجا۔ کہا کہ ان کی میز سے نیلے رنگ کی لمبی سی شیشی اٹھالا۔ مجھے یقین تھا کہ آپا ابھی کالج سے واپس نہیں آئی ہوں گی۔ بتو واپس آئی تو ایک سندیے کے ساتھ۔ آپا مجھے بلارہی ہیں۔ پوچھا کیوں؟ بولی پتہ نہیں۔

میں گھبرا گیا۔ یہ کونسا وقت ہے بلانے کا۔ ضرور کوئی کام بنائیں گی اور اچھے بھلے دن کا ستیاناس ہو جائے گا۔ مال منول کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ مجبوراً جانا پڑا لیکن عجیب ٹھیلے میں۔ بکھرے بال۔ گلا کھلا ہوا۔ ماتھ میں کالج کا بلینز اور پاؤں میں کرکٹ کے میخوں والے جوتے جو پکے فرش پر بُری طرح شور مچا رہے تھے۔

ان کے کمرے میں ڈرتا ڈرتا داخل ہوا۔

”یہی ہے وہ خبیثی!“ وہ بولیں۔

اور میں نے ایک حسین لڑکی کو دیکھا۔ جس کے پریشان بال پنکھے کی ہوا سے اور بھی پریشان ہوئے جاتے تھے۔

”سلام کرو انہیں“۔ آپا نے کہا۔

سلام کروں! — خواہ مخواہ، نہ جانے کون ہیں یہ؟

آپا نے گھور کر دیکھا اور تنگ آکر میں نے ذرا سا سر ہلادیا اور واپس آنے لگا۔

”دیکھ لیا ناس — ہاتھ لگلا سا ہے جیسا میں کہا کرتی تھی —؟“ آپا بولیں۔ اور میں گھبرا کر بلیر پہننے لگا۔

بڑی مشکل سے آپا نے ذرا دیر مجھے وہاں بٹھایا۔ میں فوراً بھاگنا چاہتا تھا بس رستہ تڑا رہا تھا۔ جی چاہتا تھا شیشے توڑ کر کھڑکی میں سے نکل جاؤں۔

بعد میں آپا نے بتایا۔ اس لڑکی کا نام نسرین ہے۔ ان کی ہم جماعت اُد بڑی عزیز ہیں ہے۔ آپا نے اس دن شام مجھے دکھانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ میں آپا سے خوب لڑا کہ میرا ذکر آپ سب سے کیوں کرتی ہیں۔ ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ کہنے کی بجائے کسی رسالے یا اخبار میں کیوں نہیں چھپوا دیتیں — کئی روز میں روٹھا رہا۔

پھر ایک روز میں کھیل کر تھکا ہوا آیا تو آپا بولیں۔ مجھے سینا لے چلو۔ کسی سہیلی کے یہاں پارٹی تھی۔ چائے کے بعد سینا جانا تھا۔ پارٹی کا وقت تو نکل چکا تھا البتہ سینا پہنچ سکتے تھے۔ سہیلیوں کے نام سے گھبرا گیا۔ بہتیرے

بہانے پیش کئے۔ تھکا ہوا ہوں۔ سر میں درد ہے، پاؤں میں مویج آگئی ہے۔ کسی اور کو ساتھ لے جائیے۔ لیکن ایک نہ چلی۔
پھر سوچا کہ کسی طرح دیر کر دیں۔ آپا سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”میں ذرا کپڑے بدل لوں۔“

”نہیں یونہی چلو۔“ وہ بولیں۔

”لیکن میرا حلیہ تو دیکھئے، خاک دھول میں اٹا ہوا ہوں۔“
”تو پھر کیا ہوا۔“ وہ ڈانٹ کر بولیں۔ ”بلایا مجھے ہے تمہیں نہیں، اور پھر ان لڑکیوں میں سے تو تمہیں کوئی جانتی بھی نہیں۔“
لڑکیوں کے نام پر مجھے رونا آگیا، آخر کون چاہتا ہے کہ انکی سہیلیوں کے سامنے جائے۔ خواہ غزاہ کی مصیبت ہے۔ مجبوراً اسی طرح ساتھ ہویا ویسے بہتیرے جتن کئے۔ کار کو پیچیدہ اور لمبے راستوں سے لے گیا کہ کسی طرح دیر ہو جائے لیکن بد قسمتی سے وقت پر سینا پہنچ گئے۔ ہمارے پہنچتے ہی کچھ شروع ہو گئی۔ اندھیرے میں اندر جانا پڑا۔ آپا کو اپنی سہیلیوں کی پڑی۔ مجھے بھی کہا گیا کہ میں بھی جھانکوں۔ دو قطاریں چھوڑ کر لڑکیوں، پلٹن بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اشارہ کیا۔ انہوں نے دیکھا تو واقعی وہ ان کی سہیلیاں ہی تھیں۔ پیچھے جگہ نہیں تھی۔ ورنہ شاید آپا پیچھے چلی جاتیں۔
”اور آپ کے پاس جگہ ہے کیا؟“ پیچھے سے آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا یہ سرین تھی۔

”ہے تو سہی، مگر بس ایک کے لئے!“ آپا بولیں۔

تو میں آ جاؤں، نسرین کی آواز آئی۔

آپا نے اپنے اور میرے درمیان کی سیٹ سے اپنا پر می بٹوا اٹھالیا۔
ادھر میں کسمایا تو سچ مح نسرین آ رہی تھی۔

”میں ذرا آگے چلا جاؤں“ میں نے آپا سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ وہ پہلے ہی خفا تھیں۔

”آخر تمہیں لڑکیوں سے وحشت کیوں ہے، بیٹھے رہو چپ چاپ۔
یہ کوئی جن ہے یا بلا۔ تمہیں کچھ نہیں کہے گی۔“

وہ میرے ساتھ آ بیٹھی اور ساری فضا معطر ہو گئی۔

کچھ دیر کے لئے میری گردن جیسے پتھر کی بن گئی۔ بس اکڑ کر سیدھا دیکھتا
رہا۔ پھر ایک آدھ مرتبہ کنکھیوں سے اُسے دیکھا اور پھرتی سے پھر اسی طرز
سنجھل کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی۔

ویسے اس لڑکی کو لباس کا سلیقہ ہے۔ اس دن بھی کیسے اچھے کپڑے
پہنے ہوئے تھی۔ آج بھی لباس موزوں ہے۔ کوئی چیز بھی بے تکی نہیں پہنی
ہوئی۔ کیسی گڑیاسی لگ رہی ہے۔

مجھے آپا کی کئی سہیلیاں یاد آ گئیں جو ایسے ایسے عجیب لباس پہنتی تھیں
کہ مجبوراً سب نے ان کے نام رکھے ہر سٹکے۔ طوطا پری، فاختہ، مسر بخورت
(جو ہمیشہ سیاہ کپڑے پہنتی تھیں، نہ جانے کس غم میں؟) نیل گائے، باگڑ بلا
تہم پوش۔ بلی ماؤں۔

آپا اور نسرین کی سرگوشیوں نے مجھے چونکا دیا جو کافی دیر سے ہو رہی

تھیں۔ اور آہستہ آہستہ بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ کچر کے کسی ایکٹر کا ذکر ہو رہا تھا اور پھر میرا، اور پھر ایک دوسرے کے کان میں کھسک رہی تھی۔

نسرین بولی: "تو آپ اسے کہہ رہی ہیں۔" اس وقت پردے پر ایک تین من کا پلا ہوا ہیرو کھڑا تھا اور کسی کے عشق میں اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔ آپا بولیں۔ "نہیں نہیں، یہ نہیں، ابھی ابھی تو آیا تھا۔ پھر آئے گا۔ ہاں وہ رہا!"۔ پردے پر ایک چھوٹا لیوٹرے چہرے کا مضبوط انسان تھا۔ جس کی بدتمیزیاں ساری کہانی پر چھائی ہوئی تھیں۔ کسی سے فرسا اختلاف ہوا اور اسے وہیں پیٹ ڈالا۔ چلتے چلتے ستون سے کہنی لگ گئی اور بھٹا کر ایک مکا ستون کو رسید کر دیا اور چلتا بھی تھا تو عجیب شان سے، مٹھیاں کسی ہوئیں، سینہ نکلا ہوا، گردن اکڑی ہوئی، ہونٹوں پر ایک عجیب سا ناؤ جیسے مسکراہٹ بھی نہیں کہہ سکتے۔ کچر کے سب افراد اس سے ڈرتے تھے اور تھا بالکل اُجڈ۔ عقل تو پاس سے بھی نہ گزری تھی۔ آپا آہستہ سے بولیں۔ "دیکھ لیا نا کتنا ملتا جلتا ہے۔ ہو بہو وہی ناک نقشہ ہے۔"

اور مجھے آگ لگ گئی۔ گویا مجھے اس بدتمیز جیسا بنایا جا رہا تھا۔ نسرین نے چپکے سے کہا۔ "کہاں ملتا ہے؟ بس قد ملتا ہے اور سینہ! باقی شکل تو۔"

"تو تو خواہ مخواہ حمایت کرے گی۔" آپا بولیں۔ "شکل ہی میں کیا ہے،

بالکل ایک جیسی تو ہے۔“

اور میرے جی میں آیا کہ مٹھیاں بھینچ کر چنچیں مارتا ہوا آس پاس نیٹھٹھ
ہوئے حضرات پر کٹوں کی بارش کر دوں اور پھر پھلانگ مار کر بھاگ
جاؤں۔

”بالکل جلتا ہے۔“ آپا پھر بولیں۔

تو گویا میری یہ عزت افزائی ہو رہی ہے۔ آئیں بڑی آپا کہیں سے۔
براہیک سے میری برائی کرتی ہیں۔ میرا دل باغیانہ خیالات سے لبریز ہو گیا۔
انسٹول ہوا اور میں منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ نسرین نے مجھے چاکلیٹ دینے
چاہے۔ میں نے ادھر دیکھا ہی نہیں۔ آپا نے پھر ہلکی سی ڈانٹ دی اور
ڈر کر مجھے چاکلیٹ لینے پڑے۔

لیکن نہ جانے وہ تھے ہی کڑوے یا مجھے لگے۔

میں ان کی باتوں میں بالکل شریک نہ ہوا۔

پکچر پھر شروع ہوئی، بد قسمتی سے اب ان صاحب کا اصلی پارٹ
شروع ہوا۔ دو آدمیوں کو گردن سے پکڑ کر ہوا میں لٹکا دیا۔ مکا مار کر ایک
دروازہ توڑ دیا۔ ایک چھوٹی سی نہر کو پھلانگ گئے۔ آپا ہیں کہ ہنس بھی
رہی ہیں اور چپکے چپکے کچھ نسرین سے بھی کہے جا رہی ہیں اور میرا غصہ سے
برا حال ہے۔

اب ایک نئی مصیبت شروع ہوئی۔ اتفاق سے ایک لڑکی ان

صاحب سے محبت کرتی تھی۔ اس بیچاری نے کتنی مرتبہ ظاہر کرنے کی

شکر نے

کوشش کی لیکن ایسے انٹری کیسے سمجھتے۔ محبت کی قسم کا کوئی جذبہ ان کے دل میں نہیں آ سکتا تھا۔ آخر جب فلم کے اختتام پر دونوں جدا ہونے لگے تو لڑکی نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔

یہ بہت پٹائے کہ یہ کیسی آفت نازل ہوئی، کچھ دیر تو منہ بنائے سوچتے رہے۔ پھر بڑی سادگی سے بولے۔ ”افره!“ — یہ تم نے شروع میں کیوں نہیں بتایا۔ بھلا اب میں کیا کر سکتا ہوں؟ —

یہ کہہ کر سلام کیا اور سگریٹ منہ میں دبا کر چل دیئے۔

اس پر جو آیا اور سرین ہنسی ہیں تو بس طوفان سا آگیا۔ میں وہاں سے ہیٹ چھوڑ چھاڑ بھاگا اور کار لے کر سیدھا گھر پہنچا۔ دیر تک متعلقین کو کوستا رہا۔ طرح طرح کے خطرناک منصوبے دل میں باندھے لیکن جلد ہی کسی ہنس مکھ دوست کا فون آگیا۔ اُس نے مجھے کھانے پر بلا لیا اور جب واپس آیا تو میں نے آپا کی خطا کسی حد تک معاف کر دی تھی۔

اس کے بعد کئی مرتبہ آپا اور سرین کو سینما لے جانے کی ڈیوٹی لگی لیکن ہمیشہ ٹال مٹول کر کے وہاں سے بھاگ آیا کرتا۔ ایک شام کو تالاب پر جا رہا تھا۔ نیر نے کا لباس پہن کر اوپر ڈرائیونگ گون اوڑھے کار کا انتظار کر رہا تھا جسے بھیالے گئے تھے۔ سوچا، اتنے میں ہاتھ پیر کھول لیں۔ بارغ کی طرف چلا گیا۔ ذرا ہی اچھل کود کی ہوگی کہ آپا کے تھقبے کی آواز سنانی دی۔ فوارے کے پاس آپا اور سرین بیٹھی چائ پی رہی تھیں۔ میں جھنجھلا اٹھا۔ آخر کیا مصیبت ہیں یہ سرین؟ سائے کی طرح کیوں پیچھے لگی ہیں؟

ایک آپا ہی کیا کم ہیں جو یہ اور تشریف لے آئیں۔

”بس بھئی اب جانے دو۔“ آپا ہنستے ہوئے بولیں۔ ”اؤ تمہیں چاہ پلائیں۔“
”شکریہ! مجھے تیرے میں دیر ہو رہی ہے۔“ میں چلتے ہوئے بولا۔

”اچھا تو یہ تیرے کی تمہید باندھی جا رہی تھی۔ یہ لڑکا بھی عجیب ہے۔ دُنیا میں کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جس کا ضبط انہیں نہ رہ چکا ہو۔ زمانے بھر کے کھیل، تصویر کشی، ایکٹنگ، فوٹو گرافی، شاعری اور نہ جانے کیا کیا الم علم، بس جب دیکھو کسی چکر میں ہیں۔ لیکن کبھی کچھ کر کے نہ دکایا۔“

میں نے بچوں کی طرح مچل کر کہا۔ ”اور وہ ڈرامے کے تنغے، کالج کا کلر، اتنے سارے کپ، نمائش والی تصویر۔ اور وہ تعریفی خطوط۔۔ اور وہ۔۔!“

”وہ تو یونہی ہو گیا اتفاق سے۔“ آپا شرارت آئینہ تبسم سے بولیں۔ ”وہ بھئی سچ پوچھو تو تم ہو بس یونہی! اب اسی تیرے کو لے لو۔ دو سال سے تم اسے یوں چمٹے ہو کہ اور کوئی ہوتا تو شاید مچھلی بن جاتا لیکن۔“
”تو اس سال دیکھ لینا!“ مجھے غصہ آ رہا تھا۔

”کیا دیکھ لینا۔ اتنے سال سے دیکھنے آرہے ہیں۔ پچھلے سال (نسرین سے) انہوں نے اتنا مجبور کیا کہ ہمارا کرکٹ میچ دیکھو۔ صبح شام بس یہی وظیفہ رہ گیا تھا۔ خیر میچ دیکھنے گئے۔ کہنے لگے۔ میں بوائنگ بہت اچھی طرح کرتا ہوں۔ جو آٹلی سیدھی گیندیں پھینکنی شروع کی ہیں۔ لوگ ہنستے ہنستے پاگل ہو گئے۔ دوسری ٹیم کا سکور بے تحاشا بڑھ گیا۔ تنگ آ کر

کپتان نے ان سے گیند لے لی، خیر ہم سمجھتے تھے کہ کچھ سکور بھی کریں گے۔ جب پیڈ وغیرہ باندھ کر بڑی شان سے گئے تو پہلے ہی گیند پر آؤٹ — آپا اسی فی صدی جھوٹ بول رہی تھیں۔

”لیکن میں نے سنا ہے یہ بڑا اچھا کھیلتے ہیں۔“ نسرین بولی۔
 ”سننے کا کیا ہے، سننے تو ہم بھی یہی تھے۔ اس روز جا کر دیکھ جو آئے۔“
 آپا بولیں — اب زیادتی ہو رہی تھی۔ میں منہ بسور کر چل دیا۔
 ”ارے! ناراض ہو گئے۔! تو یہ ایک اور خصوصیت ہے ان کی۔“
 ذرا سی بات پر ناک چڑھ جاتی ہے اور پھر روٹھ جائیں تو دیر تک نہیں ملتے۔“
 اور مجھے اُن کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔

دونوں ہیں کہ بڑے اطمینان سے چائے پی رہی ہیں اور میں بیٹھا انگلیاں چٹخا رہا ہوں۔ کچھ دیر تو انتظار کیا، پھر خود ہی چاء دانی کی طرف پکا۔
 ”افو! بڑے بے صبرے ہو۔“ آپا بولیں۔ ”آخر یوں گرم گرم ہو کر کیوں بیٹھ گئے۔ ان سے کہو کہ چاء بنائیں تمہارے لئے۔“

میں اس وقت کوکوس رہا تھا جب باغ کا رخ کیا تھا۔ ڈرتے ڈرتے
 نسرین کی طرف دیکھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے چاء بنائی۔ اب جو پیالی میری
 طرف بڑھائی ہے تو میری جانب دیکھا اور گرم گرم چائے سے میرا گون بھگیا۔
 ”معاف کیجئے!“ ان ننھے منے ہونٹوں سے آواز آئی۔ میں گاؤن جھاڑ
 رہا ہوں اور آپا کہہ رہی ہیں۔ ”چلو کیا ہوا؟ وہاں تالاب میں بھی تو بھینگتا
 ہوگا۔ ایک پیالی اور بنا دو۔“

دوسری پیالی بنی۔ نسرین نے پھر میری طرف دیکھا اور پھر ساری چار
گون پر۔۔۔ لاجول ولاقوۃ۔۔۔ اس نے جلدی سے اپنا چھوٹا سا رومال بٹھے
دے دیا کہ گاؤں خشک کر لوں۔ اس دن میں تالاب پر نہ جاسکا۔ اندھیرا
ہونے پر بارش میں درزش کرنی پڑی۔

پھر ایک شام کو میں ذرا دیر سے گھر پہنچا۔ میرے کمرے میں دھماچو کڑی
مچی ہوئی تھی۔ اندر کوئی ساری چیزیں الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ یہ ہے کون؟
میں چوکتا ہو گیا۔ نوکر تو یہ ہو نہیں سکتا۔ نہ ہی بتو ہوگی، شاید کوئی بچہ ہو۔
جو دبے پاؤں اندر گیا ہوں تو کوئی ہٹ بڑا کر بھاگا اور دوسرے دروازے
سے نکل گیا۔ لپک کر کھڑکی تک پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک سایہ تیزی
سے آپا کے کمرے میں گھس گیا۔ کمرے میں ساری چیزیں بکھری پڑی تھیں۔
صندوق کھلے ہوئے تھے۔ کپڑے کتابوں میں رکھے تھے۔ ٹائٹ پیس جوتوں میں
رکھا تھا۔ سارے کپ چار پانی کے پیچے پڑے تھے اور کیمہ فرش پر۔ بڑا
جھنجھلاہا۔ یہ حادثہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی میرے کمرے
میں اسی قسم کا بھونچال آچکا تھا۔ آخر یہ ہے کون؟ اور اسے اس حرکت
میں کیا لطف آتا ہے؟

میں نے تہمتہ کر لیا کہ آج ضرور سراغ لگاؤں گا۔ دیر تک سوچتا رہا
پھر خیال آیا کہ کہیں آپا نہ ہوں، بس وہی ہوں گی۔ میری تلاشی لے
رہی تھیں اور مجھے آتا دیکھ کر جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔
اگر یہ بات ہے تو ان سے آج خوب لڑوں گا، ناراض ہوتی ہیں تو

شکوہ

ہو جائیں۔ دراصل قصور میرا ہے۔ یہ کچھ اتنی بڑی بھی نہیں اور مفت میں اتنا رعب ڈالتی رہتی ہیں۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ کمرے کو جھنجھوڑ جاتی ہیں اور جو ان کے کمرے میں جاؤ تو مصیبت آ جاتی ہے۔ ہدایت پر ہدایت ملتی ہے۔ گلہ ان کو ہاتھ نہ لگانا، ٹوٹ جائیں گے۔ تصویروں کو دور ہی سے دیکھ لو۔ کتابوں کو الٹ پلٹ نہ کرو۔ یہ الہم ذرا احتیاط سے دیکھنا، تمہارے ہاتھ میلے تو نہیں۔ بس آج ان سے ضرور لڑوں گا۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا، اور دبے پاؤں باہر نکلا۔ ان کا کمرہ خالی تھا۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا ہوں تو پلارٹ میں اچھی خاصی کانفرنس ہو رہی تھی۔ آپا جان کی بیسیوں سیلیاں آئی ہوئی تھیں۔ کوئی چھوٹی موٹی پارٹی ہوگی شاید — اب کھیل کھیلتے جا رہے تھے۔

پھر سوچا کہ یہ موقع تو لڑائی کے لئے مناسب نہیں، کل سہی، کل لڑیں گے۔ لیکن کل تک کہیں غصہ ٹھنڈا نہ ہو جائے اور کل آپا بھی شیر ہو جائیں گی۔ کہہ دیں گی۔ مجھے کیا پتہ کون تھا؟ اور اب تو باقاعدہ ثبوت موجود ہے۔

خیر! اب جائیں کس طرح؟ — سامنے سے جانا تو ٹھیک نہیں۔ البتہ اگر پرلی طرف سے چکر بگا کر اناروں کے جھنڈ میں سے آتا تو کچھ اُمید ہو سکتی تھی۔ کیونکہ وہ کھیل ہی ایسا تھا کہ لڑکیاں بھاگتی تھیں اور دُور دُور چلی جاتی تھیں۔

کبھی نہ کبھی تو آپا اس پودے کے پاس سے گزریں گی جہاں میں چھپا

ہوں گا۔ بس اُنہیں پکڑ کر ایسا ڈراؤں گا کہ یاد ہی تو رکھیں گی۔
میں دبے پاؤں سرو کے درختوں کی آڑ لیتا، خاردار ٹہنیوں سے بچتا
اناروں کے جھنڈ کی طرف چلا۔

چاندنی خوب چٹکی ہوئی تھی — میں ڈر رہا تھا کہ کہیں نلنر نہ آجاؤں
اسی ہیر پھیر میں اناروں کے جھنڈ میں کئی مزینہ گرام بھی۔ آخر ایک جگہ چھپ
گیا۔ بالکل جھنڈ کے کنارے جہاں سے لڑکیاں گذرتی تھیں۔ کافی دیر سوچنے
کے بعد یاد آیا کہ آپا نے سہ پہر کو آسمانی بنگ کی اوڑھنی اوڑھ رکھی تھی۔
میں وکٹ کیپر کی طرح جھکا ہوا تاک میں کھڑا تھا۔ اتنے میں ایک آسمانی
دوپٹہ گزرا اور میں بے تحاشا فلاپ مار کر پیچھے بھاگا۔ انہیں جب پتہ چلا کہ
تغائب کیا جا رہا ہے تو دُگنا تیز دوڑنے لگیں۔ میں نے جان بوجھ کر رفتار
تیز نہ کی۔ کہاں تک دوڑیں گی۔ منٹوں میں پکڑے لیتا ہوں۔

اُنھوں نے دوچار چھوٹے چھوٹے نالے پھلانگے۔ پھروں کے تختوں
میں سے گزرتے ہوئے اُن کی اوڑھنی بھی اُلجھ کر رہ گئی۔ اُنھوں نے سگرتے
کے پودوں میں جو دُور دُور کھڑے تھے۔ مجھے خوب چکر دیئے — اُن کے
جوڑتے بھی کہیں رہ گئے۔ اب وہ بالکل نیگے پاؤں تھیں لیکن بدستور
دوڑ رہی تھیں۔ یکایک وہ بید مجنوں کے پودوں میں چھپ گئیں۔ میں
نے ذرا سی تلاش کے بعد اُنہیں دیکھ لیا۔ دبے پاؤں پیچھے سے جا کر
بازوؤں میں دبوچ لیا اور خوب زور سے ہلایا — اور پھر ان کے کان
میں بڑی ڈراؤنی آواز سے کہا۔ "ہاؤ، ہاؤ، وُو، وُو۔"

جب اچھی طرح جھنجھوڑ چکا تو دیکھتا ہوں کہ یہ تو نسرین تھی — بڑی شرمندگی ہوئی — یہ کیا کہنتی ہوگی — اب میں ہوں کہ معافی مانگ رہا ہوں، دیکھئے، مجھے غلط فہمی ہوئی۔ میں سمجھا آپا ہیں، آپا نے آج میری چیزوں کو چھیڑا تھا اس لئے! — آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا کہ آپ ہیں! پھر میں نے شہزاد کی چند کلیاں جلدی سے اسے دیں — بڑی گھبراہٹ میں، جیسے رشوت دے رہا ہوں۔

وہ کچھ دیر میرے سامنے کھڑی رہی۔ لمبی لمبی پلکیں اٹھائے حیرت سے مجھے دیکھتی رہی۔ چاندنی میں وہ سنگ مرمر کا مجسمہ لگ رہی تھی۔ شاید اس روز پہلی مرتبہ مجھے پتہ چلا کہ نسرین بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ پھر دیر تک ہم جوتے ڈھونڈتے رہے، ایک بڑے سے گلاب کے پردے میں اٹکی ہوئی اس کی اور صنی ملی جسے بڑی مشکل سے بچانا تھا۔ اُتارا گیا۔

آخر چلتے ہوئے اس نے بتایا کہ آپا تو شام سے پلاٹ میں نہیں۔ وہ تو گئیں۔

”اور کمرے میں کون تھا؟“ میں نے پوچھا۔
 بولی۔ ”کوئی اور ہوگا، تصویریں دیکھ رہا ہوگا۔“
 میں دیر تک سوچتا رہا۔ نسرین میری تصویریں دیکھنے آئی تھی۔ کیوں؟
 اس کے بعد میں نے بہت دنوں تک نسرین کو نہیں دیکھا۔ آپا کی سب سہیلیاں آتیں مگر وہ نہ ہوتی۔

دان بھر بیچ لیں، کر تھکا ہوا ایک آرام کرسی پر بیٹا تھا۔ میرے برابر چھڑا سا ریڈیو رکھا تھا جسے میں ایک تار لگا کر وہاں لے آیا تھا۔ دھیمی دھیمی آواز میں سنار کی کوئی گیت بچ رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے بھاگے جا رہے تھے۔ کوئی ٹکڑا چاند پر آجاتا تو چاندنی دھندلی پڑ جاتی۔ لیکن جلد ہی وہ ٹکڑا ہٹ جاتا اور پھر چاندنی کھل جاتی۔

میں سامنے سرود کو دیکھ رہا تھا جن پر کبھی چاندنی تیز ہو جاتی اور کبھی دھندلی، ایک تار ایک سی بدلی چاند پر آگئی اور بالکل اندھیرا ہو گیا۔ سرود کا درخت محض ایک سایہ سا نظر آنے لگا۔ آہستہ آہستہ ظلمت دور ہوئی اور اُجالا آیا۔

سرود کے ساتھ ایک اُجلے سائے کو دیکھا۔ جب چاند پوری طرح چکنے لگا تو وہ شبیہ اور بھی واضح ہو گئی، جیسے سنگ مرمر کا مجسمہ ہو، اور جب ہوا سے اس کے بال لہرائے تب پتہ چلا کہ یہ نسرین تھی۔ آپا نے دو تین روز پہلے بتایا تھا کہ وہ بیمار تھی۔

وہ ریڈیو کو ایک طرف سرکار میز پر بیٹھ گئی۔ پہلے سے کہیں دُبی ہو گئی تھی۔ رنگ بھی پھیکا پڑ گیا تھا۔ پہلے گلابی جھلک تھی اور اب بالکل سفید ہو گیا تھا، جو چاندنی میں بڑا اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اُلٹے سیدھے فقروں میں اس کی طبیعت پوچھی، بیماری پر افسوس ظاہر کیا۔ پتہ چلا کہ اس کا دل زیادہ دھڑکنے لگا تھا۔

”کیا بہت زیادہ دھڑکتا تھا؟“

”جی ہاں، اور بعض اوقات تو اتنا کہ اگر میرے پاس آپ ہوتے تو دُور سے سُن لیتے۔“ وہ بڑے بھولے پن سے بولی۔

چند باتیں اور ہوئیں، پھر اس نے پوچھا۔ ”ایک بات ہے، سچ سچ بتائیں گے آپ؟“

”ہاں، ہاں پوچھئے!“

”اگر میں بیماری کے دنوں میں آپ کو بُلاتی تو آپ مجھے دیکھنے آجاتے کیا؟“

”ہاں، ہاں، آجاتا۔ مہلا اس میں کیا ہے؟ ضرور آجاتا۔“

وہ کچھ دیر چُپ رہی پھر بولی۔ ”جانتے ہیں میں نے کیوں نہیں بلایا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کرتا جیسے آپ میرے سر ہانے بیٹھے ہیں۔ اپنے ماتھے پر کئی دفعہ آپ کا ہاتھ محسوس کیا۔ آپ نے کتنی ہی مرتبہ میری ہمت بندھائی۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب آپ مجھے دیکھنے نہ آئے ہوں، آپ ہمیشہ مسکراتے رہتے۔“

”تو چلیں اب۔ کافی دیر ہو گئی ہوگی!“ میں نے اپنی کلائی دیکھی جو خالی تھی۔ ”افہ گھڑی بھول آیا!“

”تو یہ لے لیجئے!“ وہ اپنی چھوٹی سی گھڑی اتارنے لگی۔

”جی نہیں۔ گراؤنڈ میں رہ گئی ہوگی کہیں! صبح بل جائے گی!“

لیکن وہ مجھے گھڑی دے رہی تھی۔

”نہیں نہیں — اور پھر یہ گھڑی! ذرا سی تو ہے بالکل۔“

ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اگر میں گھڑی دینا چاہوں تو آپ نہیں لیں گے؟“ وہ بے بسی سے

بولی۔

”مگر — وہ دیکھئے! — اچھا پھر کبھی سہی!“ میں انکار کر رہا تھا۔ لیکن

اس نے گھڑی میرے ہاتھ میں دے دی، جسے میں نے واپس کرنا چاہا اور

یہ کرتے ہوئے اس کی کلائی کو ذرا جھٹک دیا۔ یکلخت اس کا چہرہ اتر گیا۔

”تو آپ نہیں لیں گے اسے۔؟“ وہ بالکل چپ ہو گئی۔ اس کی

آنکھیں موندنے لگیں اور وہ پکارا کر گرنے لگی۔ میں نے جلدی سے اسے بازو

میں تمام لیا۔۔ اور چاند پر ایک تاریک بدلی چھائی۔

جب تک اندھیرا رہا۔ میں اسے تھامے کھڑا رہا۔ ایک لطیف اور معطر

نشتے کو جیسے بلیوں کا مار ہو۔ خوشبودار اور ہلکا پھلکا!

مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ اس کا دل تو پہلے ہی کمزور تھا۔ اتنے دنوں

سے تو بیمار تھی، اور جب وہ بدلی ہٹی اور اُجالا ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس

نے یوں آنکھیں موند رکھی تھیں جیسے حفاظت میں آکر سو گئی ہو۔ پھر میں

اُسے فوارے تک لے گیا جہاں اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیتے۔

پھر عید آئی! — رات بھر طرح طرح کے رنگین خواب دکھائی دیتے

میں نے گلاب کے بڑے بڑے پھول دیکھے، کنواریوں جتنے۔ پھر ایک

شکر نے

نیلی جھیل دیکھی، جس میں رنگ رنگ کی پنکھڑیاں تیر رہی تھیں اور جن پر فوٹج
تتلیاں ناچ رہی تھیں۔ غروب آفتاب دیکھا بے شمار پرندے دیکھے جو
اڑتے اڑتے شفق کی سُرخی میں غائب ہو جاتے تھے۔ پھر جیسے رات
ختم ہونے کو آئی۔ !

اب نیا خواب شروع ہوا۔ میں کچھ سو رہا تھا کچھ جاگ رہا تھا۔ کوئی
چپکے سے سر ہانے آکر بیٹھ گیا۔ پھر شاید میں نے کروٹ لی اور خواب
دُھندلا پڑ گیا۔

مدمم سی روشنیاں جھلملانے لگیں، لیکن جلد ہی اندھیرا چھا گیا اور
تسل پھر قائم ہو گیا۔

میرا بازو کسی نے تھام رکھا تھا۔ انگلیوں کی گرفت تیز ہوتی گئی۔ پھر
میں نے کروٹ لی۔ اس مرتبہ میں جاگ اُٹھا۔ !

پھر جیسے یکلخت کوئی کمرے سے باہر نکل گیا ہو۔ پردہ ہل رہا تھا۔
جانے والے کی ایک جھلک سی دیکھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے نسرین ہو۔

سورج کبھی کانٹا لگا رہا تھا۔ شاید کوئی مجھے جگانے آیا تھا۔

ایک طرف کسی کا ہنسا سا رومال پڑا تھا۔ جب میں نے مینر پر تین
عید کارڈ دیکھا جسے نسرین نے خود بنایا تھا تب یقین آگیا کہ وہی تھی۔

عید کے دن وہ دیر تک ہمارے ہاں رہی۔ مجھے بھی کچھ دیر کے لئے
ملی۔ اس کی بڑی بڑی محسوس آنکھیں اُداس سی تھیں، اُنچہ وہ مسکانے کی
محسوس کر رہی تھی۔

کئی دن تک اپنے بازو پر نسرین کی انگلیوں کی گرفت محسوس کرتا رہا۔
پھر گرمیاں آگئیں۔ میں امتحان میں مصروف ہو گیا۔ چھٹیاں سیاحت میں
صرف کر دیں۔

بس یہاں آکر یہ تصویریں ختم ہو جاتی تھیں! — میں نسرین کو اتنا
سی جانتا تھا۔

اب رہ دور کہیں جنگلوں میں چلی جائے گی! — شاید اب ہم کبھی نہ
ملیں اور میں اس بھولے بھالے چہرے کو نہ دیکھ سکوں، جس کے دونوں طرف
گھنگھریالے بال ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جایا کرتے تھے۔
وہ آنکھیں شاید مجھے کبھی حیرت سے نہ دیکھیں اور ان گلاب کی ٹپکڑوں
جیسے ہونٹوں کی لرزش کبھی محسوس نہ کر سکوں جو شاید کچھ کہنا چاہتے تھے اور
نہ کہہ سکے!

نہ جانے مجھے کیوں رنج ہو رہا تھا۔ بے حد اُداس تھا جیسے کچھ کھویا گیا ہو۔
میرے سامنے بید مجنوں کی ٹہنیاں ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہی تھیں۔ چکیلے
سورج کی شعاعیں چکنے چکنے پتوں پر ناچ رہی تھیں لیکن ٹہنیوں پر کچھ
اتم سا تھا۔ پتے رنجیدہ تھے۔ چکیلی دھوپ بھی اس حزن پر مطلع نہ
چڑھا سکی۔ جیسے غمگین دل پر ناپائدار مسرت کی اتنی سی بھی تہ نہیں چڑھتی!
بید مجنوں کے ساتھ شجرہ کے پودے لہرا رہے تھے۔ جب تیز
جھونکے آنے بید مجنوں کی ٹہنیاں شتر کے حین پودے سے چھو جاتیں۔ جس

کے نازک اور خوشنما پھول ہوا میں جھول رہے تھے۔ معطر پھول لچک دار ٹہنیاں پتے سب لاپرواہی سے رقص کر رہے تھے۔

دونوں پروے ساتھ ساتھ تھے۔ ایک ہی سورج کی جلاہتی وہی ہوا کے جھونکے دونوں کو چھیڑ رہے تھے۔

ایک دوسرے کو چھونے پر بھی شبہ کی ٹہنیاں اُسے ذرا سی مسرت نہ دے سکیں۔ اُسی بے پرواہی سے رقص کرتی رہیں۔

چمکیلے آسمان پر اُجلے اُجلے بادلوں کے گالے اُڑے جا رہے تھے۔ کبھی ایک دوسرے سے ملنے اور کبھی بچھڑ جاتے۔ کبھی ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ کچھ دُور چلتے۔ !

جب ملنے تو عجیب عجیب شکلیں بن جاتیں۔ کئی کارنگ بھی بدل جاتا اور جب علیحدہ ہوتے تب بھی اسی سرگرمی سے دوڑیں مصروف ہو جاتے اور پتہ بھی نہ چلتا کہ کون کس کے ساتھ تھا۔

شاید زندگی کا دار و مدار محض حادثوں پر ہے۔

یونہی اتفاق سے ہم ایک دوسرے کے نزدیک آ جاتے ہیں اور پھر ایک حادثہ ہمیں دُور پھینک دیتا ہے۔ لیکن بادلوں کی طرح وہی انہماک رہتا ہے۔ دوڑ بدستور جاری رہتی ہے!۔ زندگی کی دوڑ!



فلا سفر

اسخراں گرم سی شام کو میں نے گھر میں کہہ دیا کہ مجھ سے ایسی پیش میں نہیں پڑھا جاتا۔ ابھی کچھ اتنی زیادہ گرمیاں بھی نہیں شروع ہوئیں تھیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ امتحان نزدیک تھا اور تیاری اچھی طرح نہیں ہوئی تھی۔ یہ ایک قسم کا بہانہ تھا۔ گھر بھر میں صرف مجھے امتحان دینا تھا۔ حامد میاں امتحان سے فرنٹ ہو چکے تھے کہ اگلے سال دیں گے۔ ننھی عفت کو خواہ مخواہ اگلی جماعت میں شامل کر دیا گیا تھا۔ باقی جو تھے وہ سب کے سب پاس یا فیل ہو چکے تھے۔ لازمی طور پر میری ناز برداریاں سب سے زیادہ ہوتیں۔ طرح طرح کے ناشتے، ذرا دیر کے بعد پینے کی سرد چیزیں، اور ادھر ادھر کے کمرؤں میں مکمل خاموشی! بچوں کو ڈرایا جاتا۔ خبردار جو ان سے بات کی ہے تو، خبردار جو ان کے کمرے کے نزدیک سے گزرے۔ خبردار جو یہ کیا۔ جو وہ کیا۔ یہ امتحان دے رہے ہیں۔

ادھر امتحان کم بخت ایسا زبردست تھا کہ کسی طرح کتابیں قابو میں

نہ آتی تھیں۔ آخر تنگ آکر میں نے کہہ ہی دیا کہ مجھ سے یہاں نہیں پڑھا جانا۔ مطلب صاف ظاہر تھا کہ پہاڑ پر جاؤں گا۔ کئی دنوں تک گھر میں یہی ذکر ہوتا رہا۔

آخر ایک دن مجھ سے کہا گیا کہ تیار ہو جاؤں۔ آبا کے کوئی خاں صاحب یا خان بہادر کی قسم کے عزیز دوست، ایک مہینے سے پہاڑ پر جا چکے تھے، وہاں تار بھیجا گیا اور انہوں نے مجھے بلا لیا۔ گھر میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں میری ہم عمر ایک لڑکی بھی ہے۔ اس پر میرے کان کھڑے ہوئے۔ چنانچہ تقریباً سارے گرم سوٹ ڈرائی کلین کرانے کے لئے دیدیئے گئے۔ لیکن پھر پتہ چلا کہ وہ فلسفہ پڑھتی ہے اور بینک لگاتی ہے۔ لاجل و لا قوۃ! چلو اس کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ اب مزے سے پڑھیں گے۔ لیکن عجیب الجھن سی پیدا ہو گئی۔ فلسفی لڑکی! اُس پر طرہ یہ کہ بینک لگاتی ہے۔

میں وہاں پہنچا، ایک صاحب مجھے لینے آئے۔ میری عمر کے ہوں گے بولے۔ میں ہوں تو رفیق لیکن مجھے رقم کہا جاتا ہے۔

اُن کا مکان آٹھ دس میل دُور تھا۔ ساتھ کار لائے تھے۔ ہم نے کار بھیج دی اور کہا کہ مزے مزے سے پیدل چلیں گے۔ راستے میں خوب باتیں ہوئیں۔ پتہ چلا کہ وہ بھی کسی امتحان کے پھیر میں ہیں۔ وہ خان صاحب (خان بہادر) کے کچھ چچا سے ماموں کی بھتیجی کی خالہ کے پوتے کے چچا زاد بھائی کی قسم کے عزیز تھے۔ کافی دیر حساب لگانے کے بعد پتہ چلا کہ وہ تقریباً

شکو نے

ان کے بھتیجے تھے۔ پھر اُن فلاسفر صاحبہ کا ذکر ہوا۔ شکید نام تھا۔ ہم دونوں سے عمر میں دو تین سال بڑی تھیں اور فلسفے کی کوئی بڑی ساری ڈگری لینے کی فکر میں تھیں۔

چلتے چلتے کافی دیر ہو گئی تھی۔ رفو ہاتھ سے اشارہ کر کے بولے۔ ”بس یہ موڑ اور رہ گیا ہے۔“

سامنے بادل ہی بادل چھائے ہوئے تھے۔ آگے راستہ نظر نہ آتا تھا۔ رفو بولے۔ ”ایک عجیب بات ہے۔ یہاں ہمیشہ یا تو بادل ہوتے ہیں یا دھند“ ہم دھند میں سے گزر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ دھند صاف ہوئی۔ ہم نے آخری موڑ کو طے کیا۔ ان کی کوٹھی یک لخت سامنے آ گئی۔ بس ایک گہرا سا کھڈ تھا بیچ میں، لیکن ابھی آدھ میل کا چکر اور تھا۔ ہم نے دیکھا کہ کوٹھی کے قریب درختوں کے جھنڈ میں ایک پیخڑ پر کوئی خاتون کھڑی تھیں۔ چھریا قد، لہراتے ہوئے پریشان بال، ہلکا گلابی چہرہ، اور ناک پر کالے فریم کی ایک عینک۔

”یہی ہیں شکید۔“ رفو بولے۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔ اُنھوں نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔ اتنی بڑی نہیں تھیں۔ جنابیں سمجھے بیٹھا تھا۔ اگر وہ مولیٰ ٹسی عینک نہ ہوتی تو شاید حسین کہہ سکتے تھے۔

یا کم از کم وہ بھدا فریم نہ ہوتا۔ میں کنبے میں بہت جلد گھل مل گیا۔ رفو اور میں تو بالکل بے تکلف ہو گئے۔ لیکن شکید تھیں کہ لی ہی نہیں پڑتی تھیں۔ نہ کبھی ہماری باتوں

ہیں دلچسپی لیتیں نہ کبھی گفتگو میں شریک ہوتیں۔ ہم دونوں ان کے سامنے بہتیرے نامک ٹویئے مارتے، اول جلول باتیں کرتے۔ خوشامیں کرتے لیکن ان کی نامک ہمیشہ چڑھی رہتی۔ اور ان کا کام کیا تھا۔ صبح سے شام تک دس دس سیروزنی کتابیں پڑھنا۔

رات کو انگلیٹھی کے سامنے بیٹھی سوچ رہی ہیں۔ اتنی سنجیدگی سے جیسے دنیا کے نظام کا دار و مدار ان ہی کے سوچ بچار پر تو ہے، کبھی انگلیوں سے ہوا میں کھنکھنے لگتی ہیں، کبھی کرسی پر طلبہ بچنے لگتا ہے، کبھی جھنجھلا پڑتی ہیں، پھر یک لحنت ایک مسکراہٹ لبوں پر دوڑ جاتی ہے اور سر ہلنے لگتا ہے، جیسے سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ دفعۃً مٹھیاں بیچنے لی جاتی ہیں اور غریب صوفے کے دو تین کتے رسید کئے جاتے ہیں۔ ادھر ہم انہیں دیکھ کر جھنجھلا اٹھتے۔ یہ تو نیم پاگل ہیں بالکل۔

خان صاحب (یا خان بہادر) اور بیگم صاحبہ کا معاملہ ہی اور تھا۔ وہ باتیں سیاسیات، معاشیات، فسادیات وغیرہ کی کرتے۔ جن میں ہمیں ذرہ بھر دلچسپی نہ ہوتی۔ باقی تھے بچے وہ پہلے ہی سے احمق تھے۔ یا خاص طور پر احمق بنا دیئے گئے تھے۔ اب بھلا ہم کس سے باتیں کرتے۔ لے دے کے یہی ایک ہم عمر تھیں۔ یہی بے حد تنہائی پسند اور خشک مزاج واقع ہوئی تھیں اور ماشاء اللہ اپنی ہی دنیا میں بستی تھیں۔

کبھی منت سے کہا۔ "ہمارے ساتھ بیڈ منٹن کھیل لیجئے"۔ جواب ملا۔ "عینک ہے! عینک پر چڑیا لگے گی"۔

شگوفے

کہا "نہیں! ہم نہیں گئے دیں گے، شاٹ نہیں ماریں گے۔ بس اُچھال اُچھال کر کیلیں گے۔"

کہنے لگیں۔ "تو پھر وہ کھیل ہی کیا ہوا جو بے دلی سے کھیلا جائے۔
ویسے آپ دونوں تو سنگلز بھی کھیل سکتے ہیں، بھلا میں تیسری کیا کر دوں گی؟
پھر کسی دن کہا۔ ہمارے ساتھ سیر کو چلے۔ بولیں۔ ابھی تو مجھے
فرصت نہیں۔ بالکل فرصت نہیں۔ جب تک میں یہ تھیوری نہیں سمجھ لیتی۔"
پوچھا۔ "تو کب تک سمجھ لیں گی آپ یہ تھیوری؟"۔ جواب ملا۔
کیا پتہ۔ شاید پانچ منٹ میں سمجھ لوں۔ اور سمجھ میں نہ آئے تو مہینے
تک نہ آئے۔"

اور جو کسی دن بہت خوش ہوئیں تو بولیں۔ "بس ابھی چلتے ہیں سیر
کو۔ ذرا بچوں سے کہہ دیجئے کہ تیار ہو جائیں۔"
بچوں کے نام پر ہمارے روٹنگٹے کھڑے ہو جاتے، اور یہ بات دہیں
ختم ہو جاتی۔ عموماً میں اور روفو دونوں سیر کو جایا کرتے۔
کچھ دنوں تک تو یونہی ہوتا رہا۔ پھر ایک دن ہم نے تنگ آکر بغاوت
کر دی۔ آخر کیوں نہیں شریک ہوتیں یہ ہمارے ساتھ۔ جب ایک ہم عمر
موجود ہیں تو پھر ہم ان کی رفاقت سے کیوں محروم ہیں۔

پہلے تو طے ہوا کہ ایک رات چپکے سے ان کی ساری کتابیں جلا
دی جائیں یا کسی ندی میں پھینک دی جائیں۔ پھر سوچا کہ چند روز تک

اور کتابیں آجائیں گی۔ کافی سوچ بچار کے بعد ایک تجویز رفو کے دماغ میں آئی۔ بولے۔ ”تو تمہیں سزا ہی دینی ہے نا انہیں؟“
 ”یقیناً!“ میں نے سر ہلا کر کہا۔

”تو کیوں نہ ان سے محبت کی جائے!“ وہ میرے کان میں بولے۔
 آہا ہا ہا!۔۔۔ کتنی اچھی تجویز تھی۔ محبت کے آگے تو جھوٹ بھی ناپچتے ہیں۔ یہ تو ہیں محض فلاسفر! ہم دونوں نے ہاتھ ملائے۔ یہ بہترین تجویز تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ محبت کون کرے؟ ہم میں سے کوئی بھی اس ذمہ داری کو سر لینا نہیں چاہتا تھا۔ ایسی ویسی محبت ہوتی تو کر بھی لیتے۔ فلاسفر سے محبت کرنی تھی۔ معاملہ خطرناک تھا۔

میں نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ”بھئی اب تم ہی کر لو۔“ کیونکہ وہ ذرا دُبیلے پتلے سے تھے اور ان کی صحت محبت کرنے کے لئے زیادہ موزوں تھی۔ وہ تقریباً گڑ گڑا کر بولے۔ ”نہیں نہیں! مجھے معاف کر دو تو بہتر ہوگا۔ اول تو میں نے ابھی تک کچھ پڑھا نہیں اور دوسرے یہ کہ مجھے زکام سا رہتا ہے ہر وقت۔ پھر ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مجھے عینک سے بھی ڈر لگتا ہے!“

میں نے بھی بڑے بڑے بہانے پیش کئے۔ مگر ایک نہ چلی۔ آخر فیصلہ ہوا کہ میں اسی اتوار سے محبت شروع کر دوں۔ اس کے لئے پروگرام بنایا جائے اور ریہرسل بھی باقاعدہ کئے جائیں۔

اگلے دن ایک چھوٹا سا انگریزی کا افسانہ لکھ لکھ کر سامنے گیا۔ پہلے

تو وہ سُنتی ہی نہ تھیں۔ بڑی مشکل سے اُنہوں نے مجھے دس منٹ دیئے۔ میں نے افسانہ شروع کیا کہ کس طرح چلتی ریل میں سے ایک لڑکی دریا میں گر پڑی جو نیچے بہہ رہا تھا۔ پل کے نیچے ہیرو نے 'جو کشتی چلا رہا تھا، لپک کر لڑکی کو کرکٹ کی گیند کی طرح پکچ کر لیا اور پیچ کر بولا۔ "ہاؤ ازاٹ!" ریل کے گارڈ نے جو خوش قسمتی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ امپائر کی طرح انگلی اٹھائی اور چلا کر کہا۔ "آؤٹ!" پھر ہیرو اور ہیروئن کی آنکھیں چار ہوئیں!

"آنکھیں چار ہوئیں۔" اُنہوں نے چونک کر پوچھا۔

"جی نہیں! معاف کیجئے۔ آنکھیں چھ ہوئیں!" میں نے اُن کی عینک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اور اگر ہیرو نے بھی کہیں چشمہ لگا رکھا ہو تو پھر آنکھیں آٹھ ہوئیں۔ اور لگا ہیں شیشوں کو پار کر کے ایک دوسرے سے لڑ گئیں۔ اور۔"

"تم تو یونہی فضول باتیں کرتے ہو۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولیں۔ "جاؤ ہم نہیں سننے!"

سہ پہر کو وہ کوٹھی کے پرے ایک چھوٹے سے جھرنے کے پاس بیٹھی فلسفے کی ایک قریب اور تندرست کتاب پڑھ رہی تھیں۔ عینک اتار رکھی تھی۔ بس بھی ایک مریلی سی کتاب لے کر بیٹھ گیا۔ وہ بدستور چپ بیٹھی رہیں۔

میں نے دُور نشی سی جھیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "واہ واہ! یا نظارہ ہے۔ جھیل ہاپانی یوں چمک رہا ہے۔ جیسے چاندی کا۔"

چاندی کا شیشہ! اور اس پر اُجلی اُجلی مرغابیوں کا عکس کیسا بھلا لگتا ہے۔
 ”کیا۔؟“ انھوں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ عینک کے
 لئے جو غالباً وہاں نہ تھی۔

”آہا ہا ہا۔ ہا ہا!“ میں نے پھر کہا۔

”تو خوبصورت نظارہ ہے۔ اچھا۔“ وہ کوٹ کی جیبیں تلاش کر
 رہی تھیں۔ ”ابھی دیکھتی ہوں۔ یہ کمبخت عینک کہاں غارت ہو گئی۔ تو
 گویا مرغابیاں بھی ہیں۔ اچھا۔!“

وہ بدستور عینک ڈھونڈھ رہی تھیں۔ ”اٹو! وہاں رہ گئی۔!“
 انھوں نے ایک پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ ”ذرا لادیکھئے گا وہاں سے۔!“
 میں عینک لے آیا۔ انھوں نے صاف کر کے لگائی۔ ”بہت خوب!“

بہت اچھا نظارہ ہے!۔ لیکن وہ مرغابیاں کہاں ہیں؟
 ”بھلا وہ آپ کی عینک کا انتظار کرتیں کبھی کی اڑ گئیں۔!“۔ دراصل
 وہاں مرغابیاں تھیں ہی نہیں!

”اچھا تو اڑ گئیں۔ پھر دیکھ لیں گے کبھی۔“ انھوں نے پڑھنا شروع کر دیا
 اگلے روز میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”ذرا آج میرے ساتھ سیر
 کو چلیئے۔!“

بولیں۔ ”کیوں آج کوئی خاص بات ہے؟“۔
 ”جی نہیں! دراصل میں نے ایک نیا راستہ دیکھا ہے۔ جو پہاڑ کی دوسری
 طرف لہراتا ہوا اترتا ہے۔ وہاں اتنے دلفریب نظارے ہیں کہ کیا بتاؤں۔“

اُس طرف چلیں گے !

”ایک تو تمہارے ان دلفریب نظاروں نے عاجز کر دیا۔ خیر!“ وہ سوچنے لگیں۔ ”تو گویا نیا راستہ ہے، نظارے بھی ہیں — اور وہ بھی دلفریب — اچھا چلتے ہیں !“

اب اگلا سوال اُن کا بچوں کے متعلق ہوتا۔ میں نے جلدی سے پیش بندی کر دی۔ ”پتہ نہیں یہ بچے کہاں چلے گئے، بڑی دیر تلاش کی لیکن ایک بھی تو نہیں ملا۔“

اسی دوپہر کو میں نے اُن کی عینک کہیں چھپا دی تھی۔ چنانچہ وہ بغیر عینک کے تھیں۔ جو راستہ پہاڑ کے دوسری طرف اُترتا تھا، وہ بالکل ٹھک تھا۔ ہم دونوں کالے کالے پتھروں اور کانٹے دار جھاڑیوں میں سے گزر رہے تھے۔ ”ذرا دیکھئے تو — کیسے رنگ رنگ کے پھول کھلے ہیں۔ تنختے کے تنختے دور تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ جیسے قالین بچھے ہوں!“ میں نے چند اکھڑے ہوئے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔

”کہاں ہیں؟ اُس طرف۔ ہاں! — بڑے پیارے پھول ہیں! اتنا تو مجھے عینک کے بغیر بھی نظر آ جاتا ہے۔!“ وہ اپنی کمزوری چھپا رہی تھیں۔

”اور یہ اس طرف تو آپ نے دیکھا ہی نہیں۔ اس وقت کیمرہ ہوتا تو تصویر لیتے۔ ایک پتی سی جھلمل جھلمل کرتی ہوئی آبشار ہے پہاڑ کی چوٹی پر۔ موتیوں جیسے چمکیلے قطرے پتھروں پر ناپاچ رہے ہیں۔“ میں نے

ایک بھڑے سے پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 ”واقعی بہت پیاری آبشار ہے اور آواز بھی تو بڑی مدھم اور بھٹی ہے!“
 یہ آواز انھوں نے خواہ مخواہ سُنا شروع کر دی۔

”ارے!“ میں جیسے چونک کر بولا۔ یہ قوس قزح! — یہ قوس قزح
 اس پہاڑی سے اس پہاڑی تک چلی گئی ہے۔ ایک چھوٹا سا پل بن گیا ہے!“
 ”اور پھر رنگ کیسے نمایاں ہیں۔ خاص طور پر سبز رنگ! کل میں ضرور
 یہاں عینک لگا کر آؤں گی تاکہ ذرا اچھی طرح، نہیں، نہیں — بس بوہنی
 عینک لگاؤں گی اور اگر نہ بھی لگاؤں تو کونسا فرق پڑتا ہے۔ ویسے اب بھی
 سب کچھ نظر آ رہا ہے!“

اور دوسرے روز وہ عینک لگا کر اکیلی اسی راستے سے گئیں۔ جب
 واپس آئیں تو بُرا سا مُنہ بنا ہوا تھا اور مجھ سے اگلے دن تک بات نہ کی۔
 اتوار کی صبح آئی۔ جس دن مجھے محبت شروع کرنا تھی۔ سارا دن موقع نہ
 ملا۔ رات ہوئی اور چاندنی بھلی۔ پہاڑوں کا چمکیلا چاند تاباں تھا۔ میں ان
 کے کمرے میں گیا۔ کچھ دیر تمہید باندھی۔ چاندنی رات کی رومانی فضا کی تعریفیں
 کیں۔ فوائد بنائے۔ پھر کہا۔ ”کاش آپ اس وقت میرے ساتھ چلتیں۔“
 وہ کچھ دیر سوچتی رہیں۔ پھر پنسل سے ناک کھجا کر بولیں۔ ”آپ نے
 ایک بے معنی سی بات کہی ہے۔ بالکل بے معنی فقرہ ہیں، آپ چاہتے
 کیا ہیں؟ چاندنی رات کی سیر یا مجھ سے باتیں کرنا؟ اگر سیر کرنی ہے
 تو اکیلے پھرنا بہتر ہوگا، کیونکہ جہاں تک چاندنی رات کی لطافت — اور

رومانیت کا تعلق ہے دہاں میری کوئی ضرورت نہیں۔ اگر میں ساتھ ہوں تو آپ کبھی مجھ سے باتیں کریں گے اور کبھی فضا کی طرف متوجہ ہونے کی کوشش کریں گے۔ اگر آپ مجھ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں تو میرے پاس بیٹھیں منٹ سے زیادہ فالو وقت نہیں۔ اس دوران میں آپ جلدی سے باتیں کر لیجئے اور پھر خواہ چاندنی میں پھریئے یا اندھیرے میں۔ !

میں منہ بنائے چلا آیا۔ بسم اللہ ہی غلط نکلی۔
پھر ایک دفعہ میں نے ان کی انگلیاں چھو کر کہا۔ ”کتنی پیاری انگلیاں ہیں؟“

”آپ کا فقرہ سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ انگلیاں ہیں ہی پیاری، با صرف آپ کو پیاری لگتی ہیں؟“

”مجھے پیاری لگتی ہیں!“ میں ذرا سہم کر بولا۔
”مجھلا پیارا لگنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، ایک لمبی سی پتلی چیز، اوپر معمولی کھال، نیچے گوشت اور ہڈی۔ بس! اسی قسم اور بالکل اسی بناوٹ کی انگلیاں بھی ایسی ہی ہیں۔ آپ انھیں بھی تو پیاری کہہ سکتے ہیں۔!“
میں جھٹلا اٹھا۔ بات بات میں فلسفہ! کیا مصیبت ہے؟ رفو سے مشورہ لیا گیا۔ وہ بولے۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں، آج ایک چھوٹی سی تقریر بکھ دوں گا۔ تمہیں خوب مشق کرادوں گا۔ میں کالج میں کئی ڈرامے کر چکا ہوں۔“

پورا ایک دن ریہرسل میں ضائع ہو گیا۔

میں نے انہیں باغ میں جا پکڑا۔ وہ بدستور اکیلی بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے کتاب بند کر دی اور گھڑی دیکھنے لگیں جیسے کہنا چاہتی ہوں کہ خواہ مخواہ وقت ضائع کر دو گے اب۔ میں نے تقریر شروع کہ کس طرح کوئی کسی کے دل میں آکر بس جاتا ہے اور پھر نکلنے کا نام نہیں لیتا۔ ہر دم اسی کا خیال ستانے لگتا ہے۔

”خوب! تو یوں بھی ہو جاتا ہے کبھی۔؟“ وہ مسکرا کر بولیں۔

”جی ہاں! کئی مرتبہ ہوا۔ ہوتا رہا ہے۔ ہوا کرتا ہے۔ ہوا کرے گا۔

اور۔ اور ابھی ہوا بھی ہے۔!“

”مثلاً۔!“

”مثلاً یہی کہ مجھے۔ (دلیر بن کر) یعنی میرے دل میں ہر وقت آپ کا خیال رہتا ہے!“۔ میں جرات کر کے کہہ گیا۔ لیکن اُن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور مسکرا رہی تھیں۔

”غلط! بالکل غلط!۔ دل میں کسی کا خیال نہیں رہ سکتا۔ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں۔ وہ اعصابی نظام کے مطابق دماغ میں جاتا ہے، جب ہم سوچتے ہیں۔ دل کا سوچنے سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ دل میں خیال دیاں کے لئے کوئی جگہ ہے۔ وہاں تو بمشکل خون سما سکتا ہے۔!“

”اچھا تو یہی سہی۔ کہ دماغ میں ہر وقت آپ کا خیال رہتا ہے!“

”اگر یہ صحیح ہے تو یہ آپ کی دماغی کمزوری ہے کہ ایک معمولی سی چیز کا اثر دماغ کے مختلف حصوں پر اس قدر حاوی ہو جائے کہ کسی وقت

پہچان چھوڑے۔“

” کمزوری ہی سہی۔“ لیکن مجھے ہر وقت۔“

” آپ یہاں ہر وقت نہیں کہہ سکتے ہیں کیونکہ جب آپ سوتے ہوں گے تو یقیناً بھول جاتے ہوں گے لہذا آپ نیند کے گھنٹوں کو چوبیس گھنٹے سے نکال کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مجھے اتنے گھنٹے آپ کا خیال رہنا ہے۔ مگر یہ بھی اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب آپ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ایک ہی بات سوچتے رہیں۔“

” خیر کچھ بھی ہو۔“ میں نے جھلا کر کہا (میں تقریر کے الفاظ بھولتا جا رہا تھا) ” میں سوچتا ہوں، خواہ دل میں سوچوں یا دماغ میں، یا جگر میں، دن بھر سوچوں یا رات بھر، مگر میں سوچتا ہوں اور خوب سوچوں گا، کبھی باز نہیں آؤں گا۔ آپ کی فلاسفی مجھے متاثر نہیں کر سکتی۔ میں آپ کے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں نہ جانے کیا کر بیٹھوں (میں پھر بھول گیا) آپ چاہیں تو میں سر کے بل اس ندی میں چھلانگ لگا دوں اور (پرجوش لہجے میں) آپ چاہیں تو یہ بیماری پتھر وہاں رکھ آؤں۔ اور (ذرا بلند آواز سے) اگر آپ کہیں تو اس لودے کو جڑ سے اکھیڑ دوں۔ اور۔۔!“

” پھر آپ کی دماغی کمزوری ظاہر ہو رہی ہے۔ بھلا مجھے کیا پڑی ہے جو درخت اکھڑا دیں پھروں یا پتھروں کو ان کی جگہ سے ہواؤں۔ ایسے خیالات محض آپ کے دماغ کی اختراع ہیں اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے خیالات تندرست دماغ میں کبھی نہیں آ سکتے۔“

انھوں نے اپنی عینک اُتار دی اور صاف کرنے لگیں۔ میں تفتیراً ساری تقریر بھول چکا تھا۔ یکایک مجھے ایک دورہ سا اٹھا۔

”دیکھئے اگر آپ چاہیں تو میں پل بھر میں عینک کے شیشے صاف کر سکتا ہوں یا اس عینک کو توڑ کر ایک نئی عینک لا سکتا ہوں۔“

”چج چج۔ افوہ! دماغی کمزوری کے مزید ثبوت بل رہے ہیں۔ عینک کے شیشے صاف کرنا ایک معمولی سا کام ہے، اور پھر ایک ثابت چیز کو ضائع کر کے ویسی ہی نئی لانے میں کہاں کی عقلمندی ہے، یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ اس وقت آپ کے دماغ میں کسی عجیب جذبے کے تحت عجیب سا طوفان پایا ہے۔“

اور میں نے رفو سے آکر کہہ دیا کہ ”مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ بات بات میں مین میخ نکلتی ہے، ایک ایک فقرے کا پوسٹ مارٹم ہوتا ہے۔ بات کچھ کرنے جاؤ اور سُن کے آؤ کچھ! میں ان فلاسفر صاحبہ سے کبھی نہیں جیت سکتا۔“

مگر رفو بچے کہ برابر کہہ رہے تھے۔ ”گجراؤ مت! آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ایک توان کی اس آہستہ آہستہ نے مار رکھا تھا۔ جب جاکر نکاسیت کرو، یہی جواب ملتا کہ آہستہ آہستہ سب دُست ہو جائے گا۔ دراصل نا اُمید وہ بھی جو چلے گئے۔

رفو کے بار بار مجبور کرنے پر میں ہر روز دو چار باتیں شکیکہ سے ایسی کر جاتا جن پر دیر تک نفسے کے پیکر سُسنے پڑتے۔ مگر ایک تبدیلی اُن میں

آتی جا رہی تھی۔ پریشان بال اب سوارے جانے تھے۔ کپڑوں کا خاص خیال رکھا جانا۔ عینک بھی بدل دی گئی۔ اب بغیر فریم کی نازک سی عینک آگئی تھی۔ جس سے چہرہ بہتر معلوم ہوتا تھا۔ مگر ان کی باتیں بدستور ویسی ہی تھیں۔

آخر ایک دن میں نے پھر ہمت کی اور سر پر کفن باندھ کر اظہارِ محبت کے لئے تیار ہو گیا۔ جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ ایک ڈانٹ مل جائے گی۔ بڑی محنت اور مختلف کتابوں کی مدد سے ایک رمانی تقریر تیار کی گئی۔ اسے خوب رٹ کر آخری حملے کے لئے تیار ہو گیا۔ اظہار کے لئے شام کا دلفریب وقت چنا گیا۔ جب شفق سے سارا آسمان جھوگا رہا ہو اور ٹھنڈی معطر ہوا کے جھونکوں سے شکیلہ کے بال لہرا رہے ہوں۔ پہلے دن تو شام کو بارش ہو گئی۔ اس لئے سب کچھ ملتوی کرنا پڑا۔ دوسرے دن صبح سے رونے بجھنے طرح طرح کی چیزیں لا کر دیں۔ میں بیٹے پیتے تنگ آ گیا۔ ہارکس کا دودھ، سینا ٹو جن، لوہے کا ٹانک، چند چچے مچھلی کا تیل۔ دوپہر کو ماء اللحم پلایا گیا۔ سارا دن وہ مجھے تسلی دیتے رہے کہ شاباش گجرا نامت، معمولی سی بات ہے اور پھر کوئی روز روز تو نہیں ہوگی۔ خیر شام ہوئی۔ میں نے شکیلہ کو حسب معمول باغ میں ایک پیچ پر پڑھتے پایا۔ بغیر کسی تمہید کے میں نے تقریر شروع کر دی۔

”آج کی باتیں شاید آپ کو بُری لگیں۔ اگر لگتی ہیں تو لگا کریں، لیکن میں کہوں گا اور ضرور کہوں گا۔“ میں ایک گھٹنے کے بل جھجکا اور دامن ہاتھ

بڑھا کر بولا۔

”آپ نہیں جانتیں کہ میری زندگی کس قدر اُداس اور تنہا ہے۔ (اُنہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ جیسے کہتی ہوں کہ نہیں جانتی) میں اندھیرے میں بھٹکتا رہا ہوں۔ میں نے قدم قدم پر بھٹو کریں کھانی ہیں، لیکن اب زندگی کے اس بے پایاں سُندر میں میری تنہا کشتی کا کوئی بادبان بن گیا۔ تاریک اُفتی پر ایک روشن ستارہ طلوع ہوا۔ اور۔!“

”بڑی خوشی کی بات ہے۔!“ وہ پنسل کو بالوں میں پھیرتے ہوئے بولیں۔

”اور۔ اور میرے مرجھائے ہوئے پڑمردہ دل میں۔!“

”غالباً مرجھائے ہوئے اور پڑمردہ کا ایک ہی مطلب ہے۔ ہے نا؟

بہتر ہوتا اگر آپ ان میں سے فقط ایک استعمال کرتے۔!“

”اچھا! چلئے پڑمردہ سہی۔ تو میرے پڑمردہ دل میں پھر زندہ رہنے کی تمنا ہوئی!“

”یہ کب کا ذکر ہے۔؟“

”ابھی کا ذکر ہے۔ حال ہی کا۔!“ میں نے جلد ہی سے کہا۔ (مجھے ڈر تھا کہ کہیں یاد کئے ہوئے فقرے بھول نہ جاؤں) ”جی اور یوں لگتا ہے جیسے کسی نے میرا ماتھہ تھام لیا ہو۔!“

”یہ آپ کس سے کہہ رہے ہیں؟“

”آپ سے کہہ رہا ہوں، لا حول ولا قوۃ! آپ سُنتی رہیں۔ ٹوکیے مت

— ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا جھلا؟

”جیسے آپ نے کسی کا ہاتھ تھام لیا ہو۔“ انھوں نے لقمہ دیا۔

”شکریہ!۔ میں نے نہیں بلکہ کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا ہے اور میں

بھٹکتے بھٹکتے پھر راستے پر آگیا ہوں۔“

”لیکن جہاں آپ بھٹک رہے تھے اُسے بھی تو ہم راستہ کہہ سکتے ہیں۔

یونکہ راستہ وہ جگہ ہے جہاں سے گزرا جائے۔ بھٹکنے و ٹکنے کی کوئی شرط

نہیں ہے سچ میں۔ آپ کا فقرہ غلط ہے۔ یوں کہئے کہ آپ بھٹکتے بھٹکتے

راہِ راست پر آگئے ہیں۔“

”خیر! یوں سہی۔ میں راہِ راست پر آگیا ہوں۔ اور اب میری

زندگی۔“

”مگر وہ ہے کون جس نے یہ سب حرکتیں آپ کے ساتھ کی ہیں؟“

”نہیں بتانے۔“ میں نے بچوں کی طرح مُنہ بنا کر کہا۔

”ہم تو ضرور سنیں گے کہ وہ کون ہے!“ وہ بولیں۔

”وہ کون ہیں؟۔ آپ سچ سچ نہیں جانتیں کیا؟ وہ یہاں ہیں (میں

نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ دیا) وہ یہاں بستی ہیں۔ نہیں نہیں میرا مطلب

ہے کہ (سرکپڑ کر) یہاں بستی ہیں۔“

”کچھ آنا پتا بھی تو معلوم ہو ان کا۔“

میں گجرا گیا۔ دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ حلق خشک تھا۔ میں نے

سوگنڈ کی دوڑ کی تیاری کی اور جھلانگ لگاتے ہوئے بولا۔ ”وہ۔ آپ۔“

ہیں۔!“ اور فلا پنچ مار کر بھاگا۔ کچھ دُور جا کر مجھے چند الفاظ یاد آ گئے۔
 جنہیں بھول گیا تھا۔ بھاگتے بھاگتے رُک گیا اور پیچھے مُڑ کر زور سے بولا۔
 ”ذرا سُن لیجئے۔ آپ بالکل شگفتہ درخت — نہیں نہیں — شگفتہ پودے
 کی طرح لگتی ہیں۔ آپ کا چہرہ گلاب کے پتے کی طرح یعنی پھول کی طرح
 ہے۔ اور — میں آپ کے لئے تحفہ — یعنی آپ میرے لیے تحفہ لائیں
 گی۔ یعنی کہ انگوٹھی — یعنی کہ —“ آگے تو بالکل بھول گیا۔

واپس آتے ہی میرے سر میں سخت درد شروع ہو گیا۔ نہ جانے دن
 میں رُقبے نے کیا کیا الا بلا کھلا دی تھی۔ اُس کا نتیجہ شدید درد نکلا، کمبخت
 اسپرین وغیرہ سے بھی قابو میں نہ آیا۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ سب کے
 سب میری مزاج پُرسی کر کے جا چکے تھے۔ رُقبے کو ان کے کسی دوست نے
 باہر مدعو کر رکھا تھا۔ میں کمرے میں اکیلا لیٹا کھڑکی سے پہاڑ کی چوٹی کو
 دیکھ رہا تھا، جس کے نیچے اُجلی اُجلی روشنی شاہد تھی کہ ابھی چاند نکلے گا۔
 یکایک دروازہ کھلا۔ خوشبو کا ایک جھونپکا آیا اور کپڑوں کی سرسراہٹ
 سُنی دی۔ ایک خوبصورت سا کوٹ پہنے ٹیکیدہ داخل ہوئیں، اور میرے
 سر میں دُگنا درد شروع ہو گیا۔ اب یہ خوب دھکائیں گی۔ میں نے
 آنکھیں موند لیں اور دبک گیا۔ لیکن اُنھوں نے دھککایا نہیں، چپکے سے
 سر ہانے بیٹھ گئیں اور ملائم ہاتھوں سے سر کو آہستہ آہستہ دبانے لگیں۔
 میں نے سوچا کہ یہ تمہید باندھی جا رہی ہے۔ یہی ملائم ہاتھ ذرا سی دیر
 میں کانوں تک پہنچا چاہتے ہیں۔ ذرا آنکھ کھولی تو شامت آ جائے گی۔

شکونے

”انہوں نے میرے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور بولیں۔ ”کیا واقعی بہت درد ہے؟“

میں نے ڈرتے ڈرتے دیکھا۔

وہ مسکرا کر بولیں۔ ”شریہ کہیں کے۔ اب بجکتے شرارتوں کے نیچے!“ انہوں نے چپکے سے میری ہتھیلی پر کوئی چیز رکھ دی۔ ایک انگوٹھی، ہلکی پھلکی سی۔ میں چونک پڑا۔

”مگر۔۔۔ یہ انگوٹھی۔۔۔ فراوہ۔۔۔!“ میں انہیں واپس دینے لگا۔

”چپ!“ وہ میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بولیں۔ ”جب سر میں درد ہو تو بولا نہیں کرتے۔“

میں چپ ہو گیا۔ وہ بدستور بیٹھی سر دبا رہی تھی۔ چاند نکل آیا تھا۔ کچھ شعاعیں کھڑکی میں سے گزرتی ہوئی اُن کے چہرے سے کھینچنے لگیں۔ اُن کا چہرہ جلمکا اُٹھا۔ میں نے کن آنکھیں سے دیکھا۔ اُن کی بڑی بڑی آنکھیں جھللا رہی تھیں۔ شیشوں کا چھکارا ہو گا۔ میں نے دل میں سوچا اور جب وہ شب بخیر کہہ کر چلی گئیں تو دفعۃً مجھے یوں لگا جیسے سر کا درد جو کچھ دیر کے لئے غائب ہو چکا تھا، پھر شروع ہو گیا ہے۔ دیر تک میں انگوٹھی کے سفید جلمکاتے ہوئے نمک کو دیکھتا رہا۔

اگلے روز صبح صبح گھر سے تار آ گیا۔ ایک مہربان پروفیسر صاحب نے مجھے دو ہفتے پہلے واپس آنے کی تاکید کی تھی۔ امتحان کی تیاری کے لئے۔ شام تک سب کچھ باندھنا پڑا۔ دوسرے دن علی البصر جاننا

تھا۔ اگلی صبح میں اور رفتہ پیدل روانہ ہوئے۔ نیچے اُترتی ہوئی سڑک مڑتی تھی تو کوٹھی کے بالکل پاس سے گزرتی تھی۔ ابھی ہم اس موڑ سے فراڈور تھے جہاں سے ان کا باغ بالکل سامنے آجاتا تھا۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ کہیں میری باتوں پر وہ بُرا نہ مان گئی ہوں مگر ان کے خشک فلسفی دل پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ لیکن وہ بغیر فریم کی عینک! — وہ خوشنما ملبوس — اور انگوٹھی کا تختہ! — کیا ان کا مطلب کچھ نہیں؟ نہیں؟

نہیں غالباً کوئی مطلب نہیں! مجھے تو ہر دم یہی ڈر رہتا تھا کہ کہیں تمہیں دھمکانہ دیا جائے۔ بعض اوقات تو ہم نے بہت زیادتی کی —! ”رفو کہنے لگے۔

میں چونک پڑا — ”ایں — کیا —؟“

”اور پھر جس دن تمہیں اظہارِ محبت کرنا تھا۔ اُس روز تو میں بہت ڈرا۔ یہ فلاسفی بھی عجیب مصیبت ہے۔ اگر تشکیک کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو یا تو اچھی طرح تمہارے کان کھینچتی، یا تم سے محبت کرنے لگتی — لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔!“

”بس خیریت رہی کہ کان نہیں مروڑے گئے۔!“

”مگر — کچھ اندیشہ سا ہے میرے دل میں۔“ وہ سوچ کر بولے۔ ”ادو۔ جو انہیں تم سے محبت ہوگئی ہو — تو —؟“

”ہشت! محبت اور انہیں! بھلا فلاسفر بھی محبت کرتے ہیں کہیں؟ اور پھر عینک والے فلاسفر!“

شگوفے

ہم دونوں مہنس دیئے اُنھوں نے جیب سے اخبار نکالا اور پڑھنے لگے
ہم دونوں اُسی موڑ سے گزر رہے تھے۔ سامنے اُن کا باغ تھا —
بالکل نزدیک۔ بس پیچ میں ایک کھڈ تھا۔

ایکایک میری نگاہ سامنے کے پتھر پر گئی جہاں شکیلدہ کھڑی تھیں۔
اُن کا گلابی چہرہ پھول کی طرح چمک رہا تھا۔ بغیر فریم کی عینک کے شیشوں
سے ددبڑی بڑی آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ وہ کتنی اچھی دکھائی دے
رہی تھیں۔

رفو بدستور اخبار پڑھ رہے تھے۔ میں نے شکیلدہ کو سلام کیا۔ اُنھوں
نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔ نہ جانے اُن کے چہرے پر اتنی افسردگی
کیوں تھی۔ شیشوں کے پیچھے ان کی آنکھیں جھلک رہی تھیں۔

کہیں یہ آنسو تو نہیں؟ — نہیں! — ویسے ہی شیشوں کا چمکا
ہوگا — یونہی دھوکا ہوا۔

اب ہم موڑ کو بٹے کر رہے تھے۔ دُھند بڑھتی جا رہی تھی۔ دوچار اُبلے
اُبلے بادلوں کے ٹکڑے ہماری طرف بھاگے آرہے تھے۔ میں شکیلدہ کو
دیکھ رہا تھا۔

دُھند بڑھتی گئی۔ بادل کے ٹکڑے ہمارے سامنے آگئے اور سب
کچھ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

”کیا تھا؟“ رفو چونک کر بولے۔

”کچھ نہیں۔!“

پھر راستے میں ہم نے قوس قزح دیکھی جو نیچے وادی میں ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی تک چلی گئی تھی۔ بادلوں سے چند شعاعیں جھانکنے لگیں اور قوس قزح میں بے شمار پانی کے قطرے مریوں کی طرح چمکنے لگے۔ ہم ایک آبشار کے پاس سے گزرے پانی کی پھوار دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ پتھروں پر ہم نے ننھے منے قطرے دیکھے جو بڑی مسرت سے ناح رہے تھے۔

ایک تنگ راستے سے گزرتے ہوئے میری کہنی ایک جنگلی گلاب کو چھو گئی۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ! شبنم کے چند قطرے میری آنکھوں پر آکرے۔ میں نے قطروں کوٹ سے جھاڑا نہیں، یونہی رہنے دیا۔ پھر میری نگاہ انگلی کی انگوٹھی پر جا پڑی۔ جو شکیلہ نے مجھے دی تھی۔ جگمگ جگمگ کرتا ہوا سفید رنگ مجھے یوں لگا۔ جیسے کوئی آنسو جم گیا ہو۔ رنگ کی جھللاہٹ میں آنسو کی لرزش دکھائی دی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ جیبوں میں ڈال لئے۔

شاید رفتو کا اخبار ختم ہو چکا تھا۔ انھوں نے پھر باتیں شروع کر دیں۔

سماج

بچپن میں بھرتوں پریتوں کی فرضی کہانیاں سننے کے بعد جب سچ سچ کی کہانیاں پڑھیں تو ان میں عموماً ایک مشکل سا لفظ آیا کرتا۔ سب کچھ سمجھ میں آ جاتا۔ لیکن وہ لفظ سمجھ میں نہ آتا۔ وہ دن — اور آج کا دن، اُس لفظ کا پتہ ہی نہ چل سکا۔

وہ لفظ ہے "سماج"۔ یوں تو یہ لفظ آسان سا ہے، اس کے معنی "برادری" کے ہوں گے۔ لیکن پتہ نہیں اس جماعت کے لوگ بستے کہاں ہیں اور کیوں بات بات پر اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔ لوگوں کو کچھ کرنے نہیں دیتے، کسی کو آرام سے نہیں بیٹھتے دیتے۔ نہ جانے اس جماعت کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ اور یہ لوگ کیوں سکون کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی یہ سننے میں آیا۔ ظالم سماج، خوفناک سماج، مکروہ سماج — سنگدل سماج! —

کچھ یوں معلوم ہوتا جیسے سماج کوئی یہودہ سا آوارہ گرد شخص ہے۔

جس کا کام دن بھر ظلم کرنا اور لوگوں کو ڈرانا ہے۔ چنانچہ بچپن میں جتنا شیطان سے ڈر گتا اتنا ہی سماج سے ڈرا کرتے۔

اس کے بعد ایک اور دماغی تصویر بن گئی۔ یہ لفظ بڑے بڑے دکھائی دینے لگے۔ سماج کا شکار۔ سماج کے تیز پنجوں میں حقیر سی جان۔ سماج کے بھیانک منہ کا نوالہ۔!

کئی سال تک ہمارے لئے سماج ایک ڈراؤنا سا جانور رہا، جو اونٹ کی طرح بے ٹکا، ریچھ کی طرح مکار اور بھدّا، اور چلتے کی طرح خوفناک تھا۔ کوئی پوچھے کہ یہ اونٹ ریچھ وغیرہ اکٹھے کیسے ہو گئے؟۔ بس یوں ہی ہو گئے لڑکپن ہی تو تھا۔ اور پھر سماج کوئی سادہ چیز تو تھی نہیں، خیر! کتنے ہی دنوں ہم سماج کو خوفناک درندوں میں گنتے رہے!

اس کے بعد ذرا عقلمند ہوئے۔ اب سماج پر ایک نقاد کی طرح غور کیا تو چند اور الفاظ کھٹکنے لگے۔ سماج کے ٹھیکیدار۔ سماج کے اجارہ دار، نتیجہ جو نکلا تو افسوس ہوا کہ اب تک سماج کو بالکل غلط سمجھتے رہے، سماج تو ایسی چیز ہے جس کا ٹھیکہ بھی لیا جاسکتا ہے۔ کوئی تجارتی جنس ہوگی۔ یا شاید کاروباری چیزوں میں سے کچھ ہو، بہر حال ہمیں یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ سماج کا ٹھیکہ لینا آسان نہیں۔ بڑے دل گردے کا کام ہے لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ کیونکہ بچہ بچہ ان ٹھیکیداروں کے خون کا پیسا سا نظر آتا ہے۔ ساری خلقت ان کے پیچھے پیچھے جھاڑ کر پڑی ہوئی ہے۔ کتنے دنوں ہمیں یہ تلاش رہی کہ کسی سماج کے ٹھیکیدار کا بغور ملاحظہ

کریں، بازاروں میں تلاش کی، گلی کوچوں میں پھرے، ہر قسم کے ٹھیکیدار دیکھے، کوٹلے کے، کلڑی کے، عمارتوں کے اور نہ جانے کس کس چیز کے۔ لیکن اس قسم کا ٹھیکیدار کہیں نہ ملا۔ بیانے لوگوں سے کہا کہ آپ ہی یہ مشکل آسان کر دیجئے، لیکن کوئی مدد پر آمادہ نہ ہوا۔ پھر ایک خاتون سے جن کے ہر افسانے کے ہر صفحے پر ہر پانچ چھ سطروں کے بعد سماج کا لفظ آتا تھا، ملنے لگے اور بڑی عاجزی سے کہا کہ محترمہ آپ کو تو ان ٹھیکیداروں کا آنا پتا معلوم ہوگا۔ اگر آپ ان میں سے کسی ایک کو اس خاکسار سے ملا دیں تو ایک بوجھ مبرا سینے سے اتر جائے۔ لیکن وہ یہی سمجھیں کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔

سماج کی کہانیوں میں عموماً ایک مزدور کی محبت کسی امیر لڑکی سے ہو جاتی ہے۔ فریقین مختلف ذات پات کے ہوتے ہیں۔ آنکھ جھپکتے ہی محبت ہو جاتی ہے۔ پریم کی شراب مینوں میں چھلکنے لگتی ہے۔ پریم کے تیر مینوں کو چیر کر دلوں میں کھٹب جاتے ہیں۔ پھر رسوائی ہوتی ہے۔ اور رسوائی کیا اچھی خاصی پبلٹی کی جاتی ہے، ویسے نہ کچھ ہونا نھنا نہ ہو سکتا ہے۔ لیکن سماج نہ جانے کہاں سے بیچ میں آ جاتا ہے۔ سماج کے ٹھیکیداروں سے اپیل کی جاتی ہے۔ پھر بغاوت ہوتی ہے اور محض سماج کی ضد میں ہیروئین کو لے کر بھاگ نکلتا ہے۔ اگر ہیروئن پوچھے کہ بھلا ہم کہاں جا رہے ہیں؟ تو جواب ملتا ہے کہ ”دور۔ دور۔“ اس مکر و فریب کی دُنیا سے بہت دور! جہاں آشائیں مچلتی ہیں۔ جہاں اُننگیں پنپتی ہیں۔ جہاں سماج کا خوفناک پنجر معصوم روحوں کا تعاقب نہیں کرتا....!“ وغیرہ۔

مجھے اس قسم کی جگہ کی بڑی تلاش رہی ہے۔ خاص طور پر امتحان کی تیاری کے دنوں میں، تاکہ یکسوئی سے پڑھ سکوں۔ کوہ ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں سے سی، پی کے جنگلوں تک، اور وہاں سے سندھ کے ریگستانوں تک جا کر دیکھ لیا۔ لیکن اس قسم کی پرسکون جگہ کہیں نہیں ملی۔ جہاں بھی گیا۔ وہاں وہی مکروفریب کی قسم کی دُنیا ملی۔

فرض کیا وہ دونوں چل پڑے۔ اب کہانی لکھنے والے کا فرض ہے کہ وہ یا تو دونوں کی ورنہ کم از کم ایک کی تو ضرور خودکشی کر دے۔ ورنہ پھر کہانی ہی کیا رہی۔ اور اگر ایک انتقال کر گیا (یا کر گئی)، تو دوسرے کا انجام بھی نزدیک ہی ہے۔ عموماً یہ بھی ہوتا ہے کہ دونوں اکٹھے سماج کے چنگل میں آ جاتے ہیں اور شہیدانِ محبت کی لاشیں کسی دریا میں نہرتی ملتی ہیں۔ یا یوں ہوتا ہے کہ ایک کچھ دیر پہلے مرنا ہے اور دوسرا اس کی لاش پر چچ مار کر کرتا ہے اور مر جاتا ہے۔ میری حقیر رائے میں اس قسم کی موت بہت مشکل ہے۔ مشکل کیا ایک حد تک ناممکن ہے، پھر یہ فقرہ آتا ہے۔ ”اُن معصوم ہستیوں کی یاد میں جو سماج کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ اور آخر میں سماج پر دل کھول کر لعنت بھیجی جاتی ہے۔ اُسے خوب کو سا جاتا ہے۔ گالیاں دی جاتی ہیں۔

یہاں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بھلا ایک مزدور سے کس حکیم نے کہا ہے کہ وہ ضرور ایک سیٹھ کی لڑکی سے محبت کرے۔ بالفرض وہ محبت کر بھی لے تو پھر ضرور اس سے شادی کرنے پر بھی اُتر آئے۔ کم از کم یہی سوچ لے

کہ اسے لاکر بٹھائے گا کہاں ۔

اس قسم کے لوگ سماج کو کوسنے میں دقت ضائع کرنے کے بجائے ٹھنڈے دل سے علی باتوں پر غور کر لیا کریں تو یقیناً آفاقہ ہوگا ۔

ایک دن میرے ایک واقف آئے جنھوں نے خلافت معمول لمبے لمبے سانس لئے ۔ میں سمجھا کسی ڈاکٹر نے لمبے سانس لینے کی درزش تیربڑ کی ہے ۔ پھر انھوں نے بار بار پیٹ پر ہاتھ رکھنا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ سینے کی بھی مالش کرنے لگے ۔ مجھے رحم آنے لگا کہ بیچارے بیمار ہیں ۔ درد ہوگا کہیں ۔ ابھی تیمارداری کے لئے الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ وہ اٹھ کر چلے گئے ۔

دوسرے دن اُن کا یہی پروگرام بڑے زور شور سے شروع ہوا ۔ پوچھا کہ اب تک درد اچھا نہیں ہوا ؟ ایک روز فاقہ کر لو تو بہتر ہوگا ۔ ”بولے ۔“ یہ درد تو اب جان لے کر ٹلے گا ۔“ میں ڈر گیا ۔ پھر انھوں نے پوچھا ۔ ”کیا کبھی تمہیں کسی سے پریم ہوا ہے ؟“ میں نے چمک کر کہا ۔ ”میرے دشمنوں کو ہو پریم ، مجھے کیا مصیبت پڑی ہے ؟“

وہ منہ بسور کر بولے ۔ ”ہائے تم کیا جانو اس آگ کو ، کیا سچ مچ تمہیں پریم نہیں ہوا ؟“

”بنا تو دیا ایک دفعہ کہ نہ تو ہوا ہے اور نہ ہی ارادہ ہے ۔ خوب نیند آتی ہے ۔ سارے کھیل کھیل لیتا ہوں ۔ دوسرے تیسرے دن سینما

دیکھتا ہوں — میرے پاس ایک موٹر سائیکل بھی ہے۔ تندرست ہوں،
 مگن رہتا ہوں — پریم کی گنجائش ہی نہیں نکلتی — !
 وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر انھوں نے رُک رُک کر اپنی خوشچال
 داستانِ حُسن و عشق سنائی کہ کس طرح اُنھیں دفتر کے افسرانچارج کی
 حسین لڑکی سے محبت ہو گئی ہے اور وہ بھی ان کی طرف دیکھ کر مُسکرایا
 کرتی ہے۔

میں نے پوچھا۔ ”مسکرایا کرتی ہے؟ — کس بات پر؟“

وہ بولے۔ ”میرے گھائل دل پر مرہم لگانے کے لئے۔“

”تو پھر تم چاہتے کیا ہو۔؟“

”اُس فرشتے کو اپنا بنانا چاہتا ہوں۔“

”کس فرشتے کو؟ — ابھی تو تم افسر کی لڑکی کا ذکر کر رہے تھے۔؟“

”اسی کو۔ اس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

میں نے پوچھا۔ ”تو پھر رکاوٹ کس بات کی ہے؟“

بولے۔ ”ظالم سماج! — یہ ہندوستان کی مصیبت، یہ لعنت۔ ذلیل

سماج! — سماج کے بیٹیکیدار جنھوں نے یہ ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ سماج

کے اس مقتل میں معصوم زندگیاں ذبح ہو رہی ہیں۔ سماج کا بسیڑا

غرق ہو۔!“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”سچ سچ — یوں سماج کی گردان مت

کرو۔ پہلے یہ بناؤ۔ تمہاری آمدنی کیا ہے؟“

بولے۔ ”ایک سو اٹھانوے روپے، دس آنے، چار پائی۔“

”اور افسرانچارج کی؟“

”ساڑھے آٹھ سو۔“

”تو تم یہ چاہتے ہو کہ سماج تمہاری تنخواہ اتنی بڑھا دے کہ تم ان کا

لڑکی سے شادی کر سکو۔؟“

”نہیں تو۔ یعنی کہ۔۔ وہ دیکھئے نامیرا مطلب ہے کہ سماج۔“

”فضول گفتگو سے پرہیز کرو۔! بہتر ہوگا کہ تم ان ایک سو اٹھانوے روپے

دس آنے چار پائیوں ہی پر قانع رہو۔ اور پھر تم نے کبھی غور نہ کیا ہے کہ

کسی اچھے سے آئینے میں۔!“

”آہ! تم نہیں جانتے، پریم شکل صورت، آمدنی۔ اور تنخواہ وغیرہ

سب سے بوند ہے۔!“

”یہ سب فضول ہے۔ ہمکنی باتیں ہیں۔ میں نہیں مانتا۔ تم اسی وقت

اپنی صورت کسی آئینے میں۔!“

”آہ! ظالم سماج۔!“

میں نے سماج کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔ ”خبردار! اگر اب تم

نے سماج کو برا بھلا کہا تو شاید میں تمہارے کان کھینچنے پر مجبور

ہو جاؤں۔“

اکثر حضرات افسانے کو پڑھنے سے پہلے صفحات کو جلدی سے اُلٹ

پلٹ کر دیکھتے ہیں، اور اگر انہیں کہیں سماج کا لفظ نظر آ جاتے تو وہ فوراً افسانہ چھوڑ دیتے ہیں، اگر پوچھیں کہ ”یہ کیوں؟“ تو جواب ملتا ہے ”جنا“ اس کا پلاٹ تو پہلے ہی معلوم ہو گیا۔ یقین نہ ہو تو سن لیجئے۔ ”اس کے بعد وہ پلاٹ بھی سنا دیں گے جو قریب قریب صحیح ہی نکلے گا۔

پانچ چھ سُرخیاں تو ہیں ہی۔ بے جوڑ محبت۔ امیری غریبی کا رونا۔ عاشق کے بیوی بچوں کی علالت۔ سیٹھ کا مٹاپا۔ پلسٹی۔ بغاوت۔ اپیل۔ خودکشی۔ دوسرے نمبر پر بوڑھے آدمیوں کی کہانیاں ہوتی ہیں کہ کس طرح ایک غریب ضعیف آدمی پر مصیبتیں ٹوٹتی ہیں۔ وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ اُسے دوا تک کو پیسے میسر نہیں ہوتے۔ پڑوس کے محل میں جشن ہو رہا ہے۔

”نعموں کی صدا اتنی بلند تھی کہ اُس نے بوڑھے کے کراہنے کی مدغم آواز کو دبا لیا۔ ادھر مسرت تھی مستی تھی، سرمایہ داری نے آنکھوں پر پتھر باندھ رکھی تھی۔ ادھر ایک غریب کاری میں بدلا تھا۔ اُس کی کمزور ہڈیاں جھج رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ تھا۔ ڈاڑھی پر آنسو بہ رہے تھے وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور زمین کھودنے لگا۔ جس میں سے ایک زنگہ کو صندوچ بنی تھی اور اس میں کیا تھا؟۔ آہ! اس میں ایک حسین لڑکے کی دھندلی سی تصویر تھی۔ بوڑھے نے ایک آہ سرد کھینچی۔ اُس کے ہونٹ ہلے۔ وہ بولا۔ ”آہ ظالم سماج!“ ایک لمحے بعد اُسے غش آگیا اور پڑوس میں نعموں کی صدا میں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔

اب اس میں سماج کو ہر طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ ایک تربیہ کہ وہ شخص بوڑھا کیوں ہوا — ہمیشہ جوان کیوں نہ رہا؟ — بوڑھا تو آخر ہر کوئی ہوتا ہے۔ یہ قدرت کا آرڈر ہے۔ جو جوانی میں چھلانگیں لگاتا پھرے گا۔ وہ ایک دن بوڑھا بھی ہوگا۔ دوسرے یہ کہ وہ بوڑھا بیمار کیوں ہوا۔؟ ضرور سماج کی شرارت ہے۔ طبی کتابیں پڑھتے تو پتہ چلے گا کہ بوڑھے آدمی عموماً بیمار رہتے ہیں۔ اور بڑھا پا بذات خود ایک بیماری ہے۔

پھر یہ کہ وہ بوڑھا اتنا غریب کیوں تھا؟ — پھر یہ کہ اُسے جوانی میں جو محبت تھی۔ اُس میں سماج نے خواہ مخواہ اپنی ٹانگ کیوں اڑائی؟ — کیوں اُس کی محبوبہ کو اُس نے چھین لیا۔ کیا حق تھا سماج کو دو پریم کے متوالے دلوں کو توڑنے کا۔؟ اور ہاں ایک بات رہ گئی۔ وہ یہ کہ پڑوس میں ایک محل کیوں تھا؟ — اور سماج کی سازش سے اُس میں اُسی رات جشن کیوں ہوا؟ (مرثیہ گوئی کیوں نہ ہوئی؟) — سو یہ محل و قریع کا قصور ہے۔ حدود دار بعد کا قصور ہے اور پڑوسی سیٹھ کے پروگرام کا قصور ہے۔ اور آخر میں ان انسانوں کا قصور ہے جنہیں پڑھ کر اچھے بھلے انسان کو مایوس کیا ہو جاتے۔

یا شاید سماج اُس طاقت کا نام ہے جو کسی شخص کو اپنا واجبِ نوا جب مقصد پورا کرنے سے روکتی ہے۔ لوگوں کو فوراً امیر ہونے سے روکتی ہے۔ معمولی شکل و آمدنی والے عاشقوں کی محبت میں حائل

ہوتی ہے۔ ایک اُن پڑھ مزدور کو کار میں بیٹھنے سے باز رکھتی ہے۔ کسی کوشش کا نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا، یا کوئی اوٹ پٹانگ حرکت کر بیٹھنے تو بجائے اصل وجہ سمجھنے کے کہہ دیا کہ ظالم سماج کا قصور ہے۔

اگر اسی طرح ہر بات میں غریب سماج کو قصور وار ٹھہرایا گیا تو وہ دن دور نہیں جب کسی کو بخار چڑھے گا تو وہ منہ بسور کر کہے گا کہ یہ سماج کا قصور ہے۔ کوئی کمزور ہوا تو کہے گا کہ یہ سماج کی بُرائی ہے، اور اگر کوئی بہت موٹا ہو گیا تو بھی سماج ہی کو کوسا جائے گا۔ نالائق لڑکے امتحان میں فیل ہونے کی وجہ سماج کی کھوکھلی بنیادوں کو قرار دیں گے۔ یہاں تک کہ گالیاں بھی یوں دی جائیں گی۔ کہ ”خدا کرے تجھ پر سماج کا ظلم ٹوٹ“ ”یا اللہ اسے سماج کے پنجے میں گرفتار کر“۔ ”یا پرمانے چاہا تو سماج سر پر چڑھ کر بولے گا“ اور دعائیں بھی اسی قسم کی ہوں گی۔ ”پیسہ دیتا جا بابا خدا تجھے سماج سے بچائے“۔ ”یا میرے اللہ مجھے سماج کی ہوا سے بچائیو“ وغیرہ۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سماج کے متعلق زیادہ سوچنے والوں یا لکھنے والوں میں بیشتر تعداد کمزور چڑچڑے اور غلغلیں حضرات کی ہے۔ تندرست اور ہنس مکھ آدمیوں کو کبھی سماج کی غیبت کرتے نہیں سنا گیا۔ شاید وہ نہیں چاہتے کہ سماج کس جانور کا نام ہے۔ اور اگر کوئی اُن سے سماج کی بُرائیاں کرنے لگے تو وہ اسے ذرا اہمیت نہیں دیں گے۔ شاید سماج کے متعلق سوچتے رہنا ایک بیماری ہے۔ جس کا تعلق خون کی کمی، اعصاب کی کمزوری

اور ہاضمے کی خرابی سے ہے۔ یہ بیماری اس وقت تک رفع نہیں ہوتی جب تک دیگر شکایات رفع نہ کی جائیں اور اگر اس مرض کو یونہی چھوڑ دیا جائے تو مریض کی حالت خطرناک ہوتی جاتی ہے۔ ذرے ذرے میں اسے سماج کی کرشمہ سازیاں نظر آتی ہیں۔ رنگ رنگ کے پھول دیکھ کر اُسے افسوس ہوتا ہے کہ یہ مسرور کیوں ہیں۔ سوکھے ہوئے پتوں کو دیکھ کر کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ سوچتا ہے کہ یہ سوکھے ہوئے کیوں ہیں۔ کوڑوں کو دیکھ کر غمگین ہو جاتا ہے کہ یہ کالے کیوں ہیں۔ کسی کو ہنستے دیکھ کر اس کا خون کھولنے لگتا ہے اور یوں مُنہ بناتا ہے جیسے کہہ رہا ہو۔ ”ہنستا ہے بے ؟ ابھی کہہ دوں گا سماج سے۔“ اُسے خواب بھی عجیب و غریب دکھائی دیتے ہیں جیسے ملک ایک بہشت ہے جس میں نہ جنگل ہیں، نہ پہاڑ ہیں، نہ صحرا ہیں، نہ دریا نہ کسی دوسرے ملک کو یہاں سے کوئی راستہ جاتا ہے۔ بس ایک پیارا پیارا وطن ہے۔ نہ اونچی عمارتیں ہیں نہ جھونپڑیاں، جدھر نظر جاتی ہے ایک منزلہ کو ارڈر نظر آتے ہیں۔ آدمیوں میں جات پات کی تیز مٹانے کے لئے انھیں نمبروں سے پکارا جاتا ہے۔ مثلاً بابا کا نمبر ہے تین سو پچاس، الف بڑا بیٹا سولہ سو تیس بج ہے اور چھوٹی بچی سترہ سو سولہ ل ہے۔ سب کے سب ایک قدم کے ہیں، ایک ہی رنگ ہے اور ایک جیسے لباس۔ شکلیں بھی اتنی ملتی ہیں کہ بس نمبر سے پہچانے جاتے ہیں۔ کارخانوں میں مزدوروں کا نام و نشان تک نہیں۔ مشینیں خود بخود چل رہی ہیں اور جو کام ایسے نختے جن کے لئے مزدوروں کی اشد ضرورت

بھٹی وہ ہند کر دیتے گئے ہیں۔

ہر ایک کے پاس ایک خوبصورت سی کار ہے اور ایک حسین بیوی۔
کار کی پچھلی سیٹ پر چند بکریاں بیٹھی جگالی کر رہی ہیں۔

لوگ جہاں جا ہیں، جس وقت جا ہیں، جس سے جا ہیں۔ بلا روک
ٹوک پریم کر سکتے ہیں۔ نہ صرف پریم بلکہ شادی بھی کر سکتے ہیں۔ قرض
لے سکتے ہیں، لڑ بھگاڑ سکتے ہیں۔

پتہ نہیں یہ سب کچھ ہو سکتا ہے یا نہیں اور اگر ہو جائے تب بھی
سماج کو کوسنے والے خوش رہیں گے یا نہیں۔ غالباً نہیں! غالباً اس قسم
کے بیمار سماج حضرات کا علاج۔ بوسے کا ٹانک، پچھلی کاتیل، فروٹ
سالٹ، ورزش اور تبدیلی آب و ہوا ہے، بہتر ہوگا اگر ان کے ٹانسل نکلا
دیئے جائیں اور خراب دانت بھی۔!

ان سے زبردستی ورزش کرائی جائے اور انہیں ہنس مکھ حضرات کی
صحبت میں رکھا جائے۔ آفاقہ ہونے پر انہیں تاکید کی جائے کہ اپنی صحت
نزار رکھیں، مبادا کہیں پھر دورہ پڑ جائے۔

کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ یہ سماج کا مذاق بہت پُرانا ہو چکا ہے۔
آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سماج (جو کچھ بھی ہے اور جہاں کہیں ہے) اس
کی وہ مٹی پلید ہوئی ہے۔ جس کی انتہا نہیں۔ اب مارے شرم کے اس
نے اپنی بہت کچھ اصلاح کر لی ہے۔ وہ پشیمان ہے۔ آپ کے سامنے

سُرجھکائے کھڑا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو رواں ہیں۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ وہ سچے دل سے معافی کا خواستگار ہے۔ کیا آپ اسے معاف نہیں کریں گے۔؟ لے یہ ضرر معاف کر دیجئے، اور اس کا ثبوت اس صورت میں لی سکتا ہے کہ افسانوں میں غریب سماج کو مزید لعنت ملامت نہ کی جائے، بلکہ اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ افسانوں میں خود کشی کے واقعات ذرا کم ہو جائیں، اور مزدور سیٹھوں کی لڑکیوں سے محبت کرنا چھوڑ دیں۔ پریم کے متوالے اگر پریم کر کے ضرور ثواب ٹوٹنا چاہتے ہوں تو اپنی حیثیت کے مطابق اپنی ہی جات پات میں محبت کیا کریں، اور محبت کرنے سے پہلے ذرا کسی اچھے سے آئینے میں اپنا چہرہ بھی بغور ملاحظہ فرما لیا کریں۔

باقی رہے سماج کے ٹھیکیدار۔! سو جب سماج میں وہ بات نہ ہے گی تو ان کی ٹھیکیداری کیا خاک چلے گی، سارا کام ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ خود سیدھے راستے پر آجائیں گے۔

یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اللہ آپ سماج کی خطائیں معاف کر دیجئے!

ڈرپوک

اتنے دنوں کے بعد آج صبح موٹر سائیکل کو ہاتھ لگایا۔ اسے چلاتے وقت جیسے ٹھٹک کر رہ گیا اور نظری سامنے کی کھڑکیوں کی جانب مڑ گئیں۔ آج سے کئی سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ بالکل ایسی ہی رنگین صبح تھی۔ گلاب کے تختے بالکل مخرج ہو رہے تھے۔ شبنم کے چمکیلے قطروں سے ہر طرف موتیوں کی بارش ہو چکی تھی۔ رنگ برنگ پرندے سربلی سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے طرح طرح کی خوشبوئیں پھیلا رہے تھے۔ جب میں نے اور ایک سنہرے بالوں اور نیلگوں آنکھوں والی ننھی منی گڑیا نے ڈاکٹر صاحب کی موٹر سائیکل سٹارٹ کر دی تھی۔

اُس روز ہمیں موقع مل گیا۔ اختر نے مہینہ بھر سے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ صبح شام اُٹھتے بیٹھتے بس ایک فقرہ رہ گیا تھا۔ جس کا ورد وہ کرتی رہتی۔ تم ڈرپوک ہو۔ تم ڈرتے ہو۔ تم یوں ہو۔ تم واں ہو۔

کئی بار اس سے کہا کہ میں بالکل نہیں ڈرتا۔ آخر سائیکل تو چلا لیتا ہوں۔ لیکن موٹر سائیکل کس طرح چلاؤں۔ چلانا تو ایک طرف رہا میں

تو اُسے ہلا بھی نہیں سکتا۔ نہ یہ پتہ ہے کہ چلانے کے لئے کونسی کمانی گھمانے ہیں اور اگر چل پڑے تو روکتے کس طرح ہیں۔

وہ منہ چڑا کر کہتی۔ ڈاکٹر صاحب تو روز چلانے میں، چلانا سیکھ کیوں نہیں لیتے۔

میں کہتا۔ کوئی سبق ہو تو یاد کروں، وہ تو ہینڈل پکڑ کر ایک دُلبتی سی مارتے ہیں اور پھٹ پھٹ کی آواز آنے لگتی ہے۔ پھر نہ جانے کیا کھینچا تانی کرتے ہیں کہ دیکھتے دیکھتے موٹر سائیکل ہوا ہو جاتی ہے۔

تب کہا جاتا کہ تم یہ سب کیوں نہیں کر سکتے۔ بس ڈرتے ہونا! میں سمجھاتا کہ ابھی موٹر سائیکل کے برابر تو ہم خود ہیں۔ بڑے ہو گئے تو موٹر سائیکل چھوڑ پوری موٹر چلایا کریں گے۔ بھلا کبھی ہمارے جتنے بچوں کو موٹر سائیکل پر چڑھتے کہیں دیکھا۔؟

اس کے جواب میں ایک تصویر پیش کی جاتی۔ ایک موٹر سائیکل کو ایک لڑکا چلا رہا ہے اور ایک لڑکی پیچھے بیٹھی ہے۔ میں بہتیرا کہتا کہ یہ تصویر فرضی ہے۔ یونہی کسی نے کھینچ دی ہے۔ لیکن جواب وہی ملتا کہ بس ڈرپوک ہو!

اختر کے کہنے پر میں طرح طرح کی حماقتیں کر چکا تھا۔ ہم دونوں نے مشورہ کر کے آبا جان کی سنہری گھڑی کیاری میں بودی۔ اختر کا خیال تھا کہ پودے میں پہلے تو ننھی مٹی گھڑیاں لگیں گی۔ پھر ٹام پس لگیں گے اور جب پودا بڑا ہو کر درخت بن جائے گا تب کلاک لگیں گے۔

لیکن بادبود ایک ماہ کی دیکھ بھال اور پانی دینے کے کچھ بھی نہ ہوا۔ پھر اس کے مجبور کرنے پر بہادر بننے کے سلسلے میں ابا جان کی بندق چلا دی۔ جب بندوق چلی تو میں کہیں گرا اور بندوق کہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میری غلیل تک چھین لی گئی۔ اختر کہتی تھی کہ جو چیز جانور کو جا کر لگتی ہے وہ سالم بندوق ہی ہوتی ہے۔ یہ گولی اور چھترے یونہی بناوٹی چیزیں ہیں۔ اُس روز بندوق چلانے پر کچھ بھی ثابت نہ ہو سکا۔ یہ ضرور ہوا کہ بندوق چلنے پر گولی تو خدا جانے کہاں گئی۔ البتہ چھت پر ڈبومیاں (جو غالباً بلی سے لڑ کر چھت پر دھوپ سینک رہے تھے) تڑپ کر اُچھلے اور ساتھ رکھے ہوئے پانی کے ٹب میں گرے اور وہاں سے اُچھل کر روشن دان میں سے ہوتے ہوئے سیدھے کمرے میں جا گرے جہاں آپا کے پاس ہونے کی خوشی میں پارٹی ہو رہی تھی۔ خدا جانے اُن کی سہیلیوں پر کیا بیٹی۔ آپا جان بچد ناراض ہوئیں، اُن کے رنگ برنگے سیٹیاں بجانے والے پرندے سہم کر رہ گئے اور وہ کمبخت طوطا تو یوں دُکب گیا جیسے مر ہی گیا ہو۔

پھر پریوں کی بہت سی کہانیاں پڑھنے کے بعد اختر کے کہنے پر ساری رات چھوٹی مونی اور زرگس کی کلیوں پر پہرہ دینے میں گزار دی۔ ہم وہاں پریاں پکڑنے گئے تھے۔ اختر کے ماتھ میں ایک چھوٹا سا جال تھا۔ (جس سے ہم تتلیاں پکڑا کرتے تھے) ہم دبے پاؤں پہرہ دیتے رہے۔ جب چاند طلوع ہوا تو ہم اور بھی محتاط ہو گئے۔ اس رات مجھے بڑا ڈر لگا۔ مٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے سبکیاں آرہی تھیں۔ جب مَرغ کی اذان

سُنا دی تو اپنے اپنے کمروں میں جا ڈھکے۔ صبح صبح یہیں کھانسی بھی ہو گئی اور زکام بھی۔

سہ پہر کو ہم باغ میں کھیل رہے تھے، ایک درخت کے نیچے منشی جی نماز پڑھ رہے تھے۔ اختر کی اور منشی جی کی آپس میں چٹم چوٹ رہتی تھی۔ اختر بولی۔ ”جب کوئی شخص نماز پڑ رہا ہو تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”کیا مطلب۔؟“

”بولی۔“ اب یہ جو منشی جی نماز پڑھ رہے ہیں۔ اگر تم ان کا کان کاٹنا چاہو تو ہرگز نہیں کاٹ سکتے۔“

میں نے کہا۔ ”کاٹ سکتا ہوں۔“ وہ بولی ”بالکل نہیں۔“ میں مُصہر ہوا۔ آخر طے ہوا کہ جب منشی جی اس دفعہ نیت باندھیں تو میں اُن کا کان کاٹ دوں۔ شرط بھی لگی۔ اختر ددڑ کر چچا جان کی شکاری چھری لے آئی۔ میں نے اچھی طرح چھری پکڑی اور تاک میں بیٹھ گیا۔ منشی جی سجدے میں گئے۔ اب جو وہ بیٹھے ہیں تو پیک کر اُن کا کان مضبوطی سے پکڑا اور چھری پھیر دی۔ ادھر کان ہے کہ کٹتا نہیں۔ میں ہوں کہ زور لگا رہا ہوں۔ کیا مجال ہے جو منشی جی ذرا بھی ہلے ہوں۔ بدستور پڑھتے رہے۔ اختر کے قہقہوں پر دوچار نہ کر چلے آئے۔ جو دیکھتا ہوں تو چھری اُلٹی پکڑ رکھی ہے۔ نوکروں کو دیکھ کر ہم وہاں سے بھاگے۔ کتنے دنوں تک ڈرتا رہا کہ اگر چھری کی دھار منشی جی کے کان پر پھیر دیتا، تو واقعی اُن کا کان میرے ہاتھ میں آ جاتا اور پھر خون

بھی نکلتا۔

ایک روز ہم آپا کے ساتھ سینما گئے۔ جہاں ہم نے نئے بازی کی ایک فلم دیکھی۔ اختر کو مکا بازی بہت پسند آئی۔ گھر پہنچ کر کہنے لگی آؤ لڑیں۔ مجھے اُن دنوں بُخار آتا تھا۔ وہ ساری گرمیاں پہاڑ پر گزار کر آئی تھی اور خوب سُرخ ہو رہی تھی۔

پہلے تو ٹال مٹول کی کہ بھلا ایک لڑکی سے کیا لڑوں گا۔ وہ کہنے لگی تم ڈرتے ہو، خیر مکا بازی ہوئی۔ اُس نے اپنے لمبے لمبے تیز ناخنوں سے میرا چہرہ نوچ لیا اور جب میں نے اُسے پرے دھکیلا تو اُس نے وہ دوڑ کر میری کلائی میں اس بُری طرح کاٹا کہ اب تک نشان موجود ہے پھر جو روئی ہے تو چپ کرنا مشکل ہو گیا۔ تتلیوں کے سارے پر، چاکلیٹ سے نکلی ہوئی تصویریں۔ گولیاں۔ جو کچھ میرے پاس تھا سب کچھ اُسے دیا۔ تب جا کر چپ ہوئی۔

میں کچھ ایسا ڈرتا بھی نہیں تھا۔ ایک تو مجھے اختر کے جتوں، بھوتوں کے قصوں نے پریشان کر رکھا تھا۔ صبح سے شام تک طرح طرح کی جھوٹی سچی کہانیاں سنایا کرتی اور میں یقین کر لیتا۔ رات کے گیارہ بجے ہوں گے۔ سب سینڈ شو دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کو اُستانی جی پڑھا کر چلی گئیں۔ کمروں میں ڈر لگتا تھا۔ اس لئے ہم برآمدے میں بیٹھے تھے، باہر بڑے زور سے بارش ہو رہی تھی۔ بجلی

چمک رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔

اختر نے ایک کہانی شروع کی۔ ”اندھیری رات تھی۔ ایک بہت ہی ڈراؤنے اور اُجاڑ جنگل سے ایک ٹرین گزر رہی تھی۔ بُری طرح بارش ہو رہی تھی۔ ایک لمبے خطرناک سے ڈبے میں صرف دو آدمی بیٹھے تھے۔“

مجھے ڈر لگنے لگا۔ یہ اختر کبھی خواہ مخواہ ایسی باتیں کرتی ہے۔ بھلا ریل کا ڈبہ خطرناک کیسے ہو گیا؟ سوچنے لگا شاید اب یہی ہو گا کہ ایک آدمی دوسرے کی مرمت کرے گا۔ یا چلتی ریل سے باہر پھینک دے گا۔ میں نے اپنی کرسی کھینچ کر اُس کے نزدیک کر لی۔

وہ بڑے اطمینان سے کہانی سن رہی تھی۔ ”دونوں آدمی چپ چاپ بیٹھے تھے۔ بجلی زور سے کڑکی — ایک آدمی دوسرے سے بولا۔“ کیوں صاحب آپ بھوت پریت کو مانتے ہیں؟“

دوسرا بولا۔ ”جی نہیں! میں تو نہیں مانتا۔ اور آپ؟“

پہلا بولا۔ ”میں تو مانتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ دھواں بن کر اڑ گیا۔

”دھواں بن کر اڑ گیا؟ کہاں اڑ گیا؟“ میں نے قریب قریب پیچھے

ہوئے کہا۔

”بھئی خاتب ہو گیا۔ دراصل وہ خود بھوت تھا اور آدمی کا بھیس بدلے

بیٹھا تھا۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”پھر کیا ہونا تھا۔ وہ بیچارہ ڈبے میں رہ گیا تھا اُس کا جو حال ہوا ہرگا

ہم بجزی اندازہ لگا سکتے ہیں۔“

میں نے اپنی کرسی اور نزدیک کھینچ لی۔

وہ ڈراؤنا منہ بنا کر بولی۔ ”اور اگر میں یہاں بیٹھی بیٹھی غائب ہو جاؤں“

بس دھواں بن کر اڑ جاؤں تب؟“

میں نے لپک کر اُسے پکڑ لیا۔ اتنے زور سے دبوچا جیسے وہ سچ مچ

اڑ جائے گی۔ وہ کہنے لگی۔ ”اور جوئیں انسان نہ ہوں تو — کچھ اور ہوں؟“

میں اس قدر ڈرا کہ ایسی سردرات میں اتنا پسینہ آیا کہ کپڑے بھیک

گئے۔ مدتوں یہی سوچا کرتا کہ کیا ہو جو یہ اختر کوئی چڑیل وغیرہ ہی ہو۔

ایک رات اتنی بولیں۔ ”نہنے ذرا اندر سے مارچ اٹھا لاؤ۔ مالی کہیں

باہر جاتے گا۔“

میں بڑا دلیر بن کر اندھیرے کمرے سے مارچ اٹھا لایا۔

اختر بولی۔ ”بڑے بہادر بنے پھرتے ہو۔ وہ کہانی بھی سُنی ہے تم

نے اندھیرے کمرے اور ماچس والی؟“

میں سہم گیا۔ ”کونسی کہانی؟“

”وہی کہ ایک شخص اندھیرے کمرے میں ماچس لینے گیا۔ اندر سخت

تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی نہ دیتا تھا۔ وہ ادھر ادھر ٹٹل رہا تھا کہ

لیکھت اُس کے ہاتھ میں ماچس تھا دی گئی!“

”ماچس دے دی۔ کس نے؟“

”نہ جانے کون تھا۔ وہ چیخ کر باہر بھاگا۔ لوگوں نے بہتیرا تلاش

کیا۔ لیکن اندر کوئی نہ تھا۔ لہذا اندھیرے کمرے میں جاتے ہوئے ذرا ہشیار رہنا چاہئے۔“
اس کے بعد مدت تک میں کسی اندھیرے کمرے میں نہیں گھسا۔

آخر اُس کے بار بار کہنے پر تنگ آ کر میں نے تہیہ کر لیا کہ ضرور ایک روز موٹر سائیکل چلاؤں گا۔ اختر کو یقین تھا کہ سارا ڈرتب تک ہے، جب تک موٹر سائیکل چلتی نہیں۔ ایک دفعہ چل پڑے تو بس۔ یوں لگے گا جیسے معمولی سائیکل چلا رہے ہوں۔

جب کبھی ڈاکٹر صاحب موٹر سائیکل چلاتے تو ہم بڑے غور سے سارا عمل دیکھتے۔ شروع شروع کی باتیں تو سمجھ میں آ جاتیں۔ لیکن بعد میں جو تین چار حرکتیں اکٹھی کر جاتے۔ اُن کا کچھ پتہ نہ چلتا۔

اختر بولی۔ ”تم پوچھ کیوں نہیں لیتے ڈاکٹر صاحب سے۔“
میں نے کہا۔ ”بتائیں گے نہیں، اور ممکن ہے کہ ناراض ہو جائیں اور پینے کو سخت کڑوی کیسلی دوائیاں دیں۔“
بولی۔ ”تم ڈرپوک ہو۔“

میں جھٹلا اٹھا اور سینہ پھٹا کر بولا۔ ”آج ڈاکٹر صاحب سے ضرور پوچھوں گا۔“

ڈاکٹر صاحب اندر سے نکلے۔ میں برآمدے میں کھڑا تھا۔ اُن کے ساتھ باہر تک گیا۔ اُنھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میں نے سلام کیا۔

بولے۔ ”ایک سو اٹھانوے روپے، دس آنے، چار پائی۔“

”اور افسر انچارج کی؟“

”ساڑھے آٹھ سو۔“

”تو تم یہ چاہتے ہو کہ سماج تمہاری تنخواہ اتنی بڑھا دے کہ تم ان

لڑکی سے شادی کر سکو۔؟“

”ہنیں تو۔ یعنی کہ۔۔۔ وہ دیکھئے نا میرا مطلب ہے کہ سماج۔“

”فضول گفتگو سے پرہیز کرو۔! بہتر ہوگا کہ تم ان ایک سو اٹھانوے روپے

دس آنے چار پائیوں ہی پر قانع رہو۔ اور پھر تم نے کبھی غور نہ اپنی شکل

کسی اچھے سے آئینے میں۔!“

”آہ! تم نہیں جانتے، پریم شکل صورت، آمدنی۔ اور تنخواہ وغیرہ

سب سے بلند ہے۔!“

”یہ سب فضول ہے۔ نکمٹی باتیں ہیں۔ میں نہیں مانتا۔ تم اسی وقت

اپنی صورت کسی آئینے میں۔!“

”آہ! ظالم سماج۔!“

میں نے سماج کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔ ”خبردار! اگر اب تم

نے سماج کو برا بھلا کہا تو شاید میں تمہارے کان کھینچنے پر مجبور

ہو جاؤں۔“

اکثر حضرات افسانے کو پڑھنے سے پہلے صفحات کو جلدی سے اُلٹ

پلٹ کر دیکھتے ہیں، اور اگر انہیں کہیں سماج کا لفظ نظر آ جاتے تو وہ فوراً افسانہ چھوڑ دیتے ہیں، اگر پوچھیں کہ یہ کیوں ہے تو جواب ملتا ہے۔ "جناب اس کا پلاٹ تو پہلے ہی معلوم ہو گیا۔ یقین نہ ہو تو سن لیجئے۔" اس کے بعد وہ پلاٹ بھی سنا دیں گے جو قریب قریب صحیح ہی نکلے گا۔

پانچ چھ سُرخیاں تو ہیں ہی۔ بے جوڑ محبت۔ امیری غریبی کا رونا۔ عاشق کے بیوی بچوں کی علالت۔ سیٹھ کا مٹاپا۔ پبلسیٹی۔ بغاوت اپیل۔ خودکشی۔ دوسرے نمبر پر بوڑھے آدمیوں کی کہانیاں ہوتی ہیں کہ کس طرح ایک غریب ضعیف آدمی پر مصیبتیں ٹوٹتی ہیں۔ وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ اُسے دوا تک کو پیسے میسر نہیں ہوتے۔ پڑوس کے محل میں جشن ہو رہا ہے۔

"نغموں کی صدا اتنی بلند تھی کہ اُس نے بوڑھے کے کراہنے کی مدھم آواز کو دبا لیا۔ ادھر مسرت تھی مسرت تھی، سرمایہ داری نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی۔ ادھر ایک غریب بیماری میں مبتلا تھا۔ اس کی کمزور ہڈیاں چٹخ رہی تھیں۔ ماتھے پاؤں میں رعنشہ تھا۔ وارنھی پر آنسو بہ رہے تھے وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا، اور زمین کھودنے لگا۔ جس میں سے ایک رنگ آلود صندل چٹکی نکلی اور اس میں کیا تھا۔؟۔ آہ! اس میں ایک حسین لڑکی کی دھندلی سی تصویر تھی۔ بوڑھے نے ایک آہ سرد کھینچی۔ اُس کے ہونٹ ہلے۔ وہ بولا۔ "آہ ظالم سماج!" ایک لمحے بعد اُسے غش آگیا اور پڑوس میں نغموں کی صدا ایسے بلند ہوتی جا رہی تھیں۔"

اب اس میں سماج کو ہر طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ ایک تریہ کہ وہ شخص بوڑھا کیوں ہوا — ہمیشہ جوان کیوں نہ رہا؟ بوڑھا تو آخر ہر کوئی ہوتا ہے۔ یہ قدرت کا آرڈر ہے — جو جوانی میں چھلنا نہیں لگاتا پھرے گا۔ وہ ایک دن بوڑھا بھی ہوگا۔ دوسرے یہ کہ وہ بوڑھا بیمار کیوں ہوا — ضرور سماج کی شرارت ہے — طبی کتابیں پڑھتے تو پتہ چلے گا کہ بوڑھے آدمی عموماً بیمار رہتے ہیں — اور بوڑھا پا بذات خود ایک بیماری ہے۔

پھر یہ کہ وہ بوڑھا اتنا غریب کیوں تھا؟ — پھر یہ کہ اُسے جوانی میں جو محبت تھی۔ اُس میں سماج نے خواہ مخواہ اپنی ٹانگ کیوں اڑائی؟ کیوں اُس کی محبوبہ کو اُس نے چھین لیا — کیا حق تھا سماج کو دو پریم کے متوالے دلوں کو توڑنے کا؟ اور ہاں ایک بات رہ گئی — وہ یہ کہ پڑوس میں ایک محل کیوں تھا؟ — اور سماج کی سازش سے اُس میں اُسی رات جشن کیوں ہوا؟ (مرثیہ گوئی کیوں نہ ہوئی؟) — سو یہ محل وقوع کا قصور ہے۔ حدود دار بعد کا قصور ہے اور پڑوسی سیٹھ کے پردگراں کا قصور ہے۔ اور آخر میں ان انسانوں کا قصور ہے جنہیں پڑھ کر اچھے بھلے انسان کو بالینو لیا ہو جاتے۔

یا شاید سماج اُس طاقت کا نام ہے جو کسی شخص کو اپنا واجب ناما واجب مقصد پورا کرنے سے روکتی ہے۔ لوگوں کو فوراً امیر ہونے سے روکتی ہے۔ معمولی شکل و آمدنی والے عاشقوں کی محبت میں حائل

ہوتی ہے۔ ایک اُن پڑھ مزدور کو کار میں بیٹھنے سے باز رکھتی ہے۔ کسی کوشش کا نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا، یا کوئی اوٹ پٹانگ حرکت کر بیٹھتے تو بجائے اصل وجہ سمجھنے کے کہہ دیا کہ ظالم سماج کا قصور ہے۔

اگر اسی طرح ہر بات میں غریب سماج کو قصور وار ٹھہرایا گیا تو وہ دن دور نہیں جب کسی کو بخار چڑھے گا تو وہ منہ بسور کر کہے گا کہ یہ سماج کا قصور ہے۔ کوئی کمزور ہوا تو کہے گا کہ یہ سماج کی بُرائی ہے، اور اگر کوئی بہت موٹا ہو گیا تو بھی سماج ہی کو کوسا جائے گا۔ نا لائق لڑکے امتحان میں فیل ہونے کی وجہ سماج کی کھوکھلی بنیادوں کو قرار دیں گے۔ یہاں تک کہ گالیاں بھی یوں دی جائیں گی۔ کہ ”خدا کرے تجھ پر سماج کا ظلم ٹوٹے“ یا ”اللہ اسے سماج کے پیچھے میں گرفتار کرے“۔ یا ”پرمانے چاہا تو سماج سر پر چڑھ کر بولے گا“ اور دُعائیں بھی اسی قسم کی ہوں گی۔ ”پیسہ دیتا جا بابا خدا تجھے سماج سے بچائے“۔ یا ”میرے اللہ مجھے سماج کی ہوا سے بچائے“ وغیرہ۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سماج کے متعلق زیادہ سوچنے والوں یا کھنے والوں میں بیشتر تعداد کمزور چڑچڑے اور غلگین حضرات کی ہے۔ تندرست اور سنس مکھ آدمیوں کو کبھی سماج کی غیبت کرتے نہیں سنا گیا۔ شاید وہ نہیں چاہتے کہ سماج کس جانور کا نام ہے۔ اور اگر کوئی اُن سے سماج کی بُرائیاں کرنے لگے تو وہ اسے ذرا اہمیت نہیں دیں گے۔ شاید سماج کے متعلق سرچتے رہنا ایک بیماری ہے۔ جس کا تعلق خون کی کمی، اعصاب کی کمزوری

اور ہاضمے کی خرابی سے ہے۔ یہ بیماری اس وقت تک رفع نہیں ہوتی جب تک دیگر شکایات رفع نہ کی جائیں اور اگر اس مرض کو یونہی چھوڑ دیا جائے تو مریض کی حالت خطرناک ہوتی جاتی ہے۔ ذرے ذرے میں اسے سماج کی کرشمہ سازیاں نظر آتی ہیں۔ رنگ رنگ کے پھول دیکھ کر اُسے افسوس ہوتا ہے کہ یہ مسرور کیوں ہیں۔ سوکھے ہوئے پتوں کو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ سوچتا ہے کہ یہ سوکھے ہوئے کیوں ہیں۔ کوؤں کو دیکھ کر غمگین ہو جاتا ہے کہ یہ کالے کیوں ہیں۔ کسی کو ہنستے دیکھ کر اس کا خون کھولنے لگتا ہے اور یوں منہ بناتا ہے جیسے کہہ رہا ہو۔ ”ہنسنا ہے بے؟ ابھی کہہ دوں گا سماج سے۔!“ اُسے خواب بھی عجیب و غریب دکھائی دیتے ہیں جیسے ملک ایک بہشت ہے جس میں نہ جنگل ہیں، نہ پہاڑ ہیں، نہ صحرا ہیں، نہ دریا نہ کسی دوسرے ملک کو یہاں سے کوئی راسخہ جاتا ہے۔ بس ایک پیارا پیارا وطن ہے۔ نہ اونچی عمارتیں ہیں نہ جھونپڑیاں، جدھر نظر جاتی ہے ایک منزلہ کو ارٹھر نظر آتے ہیں۔ آدمیوں میں جات پات کی تمیز مٹانے کے لئے انھیں نمبروں سے پکارا جاتا ہے۔ مثلاً ابا کا نمبر ہے تین سو پچاس، الف بڑا بیٹا سولہ سو تیس بی بی ہے اور چھوٹی بی بی سترہ سو سولہ ل ہے۔ سب کے سب ایک قد کے ہیں، ایک ہی رنگ ہے اور ایک جیسے لباس۔ شکلیں بھی اتنی ملتی ہیں کہ بس نمبر سے پہچانے جاتے ہیں۔ کارخانوں میں مزدوروں کا نام و نشان تک نہیں۔ مشینیں خود بخود چل رہی ہیں اور جو کام ایسے تھے جن کے لئے مزدوروں کی اشد ضرورت

بھٹی وہ بند کر دیتے گئے ہیں۔

ہر ایک کے پاس ایک خوبصورت سی کار ہے اور ایک حسین بیوی۔
کار کی پچھلی سیٹ پر چند بکریاں بیٹھی جگالی کر رہی ہیں۔

لوگ جہاں جا ہیں، جس وقت چاہیں، جس سے چاہیں۔ بلا روک
ٹوک پریم کر سکتے ہیں۔ نہ صرف پریم بلکہ شادی بھی کر سکتے ہیں۔ قرص
لے سکتے ہیں، لڑ جھگڑ سکتے ہیں۔

پتہ نہیں یہ سب کچھ ہو سکتا ہے یا نہیں اور اگر ہو جائے تب بھی
سماج کو کوسنے والے خوش رہیں گے یا نہیں۔ غالباً نہیں! غالباً اس قسم
کے بیمار سماج حضرات کا علاج۔ موبے کا ٹائیک، مچھلی کا ٹیل، فروٹ
سائٹ، ورزش اور تبدیلی آب و ہوا ہے، بہتر ہوگا اگر ان کے ٹائسل نکلوا
دیئے جائیں اور خراب دانت بھی۔!

ان سے زبردستی ورزش کرائی جائے اور انہیں ہنس مکھ حضرات کی
صحبت میں رکھا جائے۔ آفاق ہونے پر انہیں تاکید کی جائے کہ اپنی صحت
میں برقرار رکھیں، مبادا کہیں پھر دورہ پڑ جائے۔

کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ یہ سماج کا مذاق بہت پُرانا ہو چکا ہے۔
آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سماج (جو کچھ بھی ہے اور جہاں کہیں ہے) اس
کی وہ مٹی پلید ہوئی ہے۔ جس کی انتہا نہیں۔ اب مارے شرم کے اس
نے اپنی بہت کچھ اصلاح کر لی ہے۔ وہ پشیمان ہے۔ آپ کے سامنے

سُرُجھکاٹے کھڑا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو رواں ہیں۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ وہ پتے دل سے معافی کا خواستگار ہے۔ کیا آپ اسے معاف نہیں کریں گے۔؟ لے یہ ضررِ معاف کر دیجئے، اور اس کا ثبوت اس صورت میں مل سکتا ہے کہ افسانوں میں غریب سماج کو مزید لعنتِ ملامت نہ کی جائے، بلکہ اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ افسانوں میں خودکشی کے واقعات ذرا کم ہو جائیں، اور مزدور سیٹھوں کی لڑکیوں سے محبت کرنا چھوڑ دیں۔ پریم کے متوالے اگر پریم کر کے ضرور ثواب ٹوٹنا چاہتے ہوں تو اپنی حیثیت کے مطابق اپنی ہی جات پات میں محبت کیا کریں، اور محبت کرنے سے پہلے ذرا کسی اچھے سے آئینے میں اپنا چہرہ بھی بغور ملاحظہ فرمایا کریں۔

باقی رہے سماج کے ٹھیکیدار۔! سو جب سماج میں وہ بات نہ ہے گی تو ان کی ٹھیکیداری کیا خاک چلے گی، سارا کام ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ خود سیدھے راستے پر آجائیں گے۔

یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اللہ آپ سماج کی خطائیں معاف کر دیجئے!

ڈرپوک

اتنے دنوں کے بعد آج صبح موٹر سائیکل کو ہاتھ لگایا۔ اسے چلاتے وقت جیسے ٹھٹک کر رہ گیا اور نظریں سامنے کی کھڑکیوں کی جانب مڑ گئیں۔ آج سے کئی سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ بالکل ایسی ہی رنگین صبح تھی۔ گلاب کے تختے بالکل سُرخ ہو رہے تھے۔ شبنم کے چمکیلے قطروں سے ہر طرف موتیوں کی بارش ہو چکی تھی۔ رنگ برنگ پرندے سُریلی سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے طرح طرح کی خوشبوئیں پھیلا رہے تھے۔ جب میں نے اور ایک سنہرے بالوں اور نیلگوں آنکھوں والی ننھی مٹی گڑیا نے ڈاکٹر صاحب کی موٹر سائیکل سٹارٹ کر دی تھی۔

اُس روز ہمیں موقع مل گیا۔ اختر نے ہمیں بھر سے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ صبح شام اُٹھتے بیٹھتے بس ایک فقرہ رہ گیا تھا۔ جس کا ورد وہ کرتی رہتی۔ تم ڈرپوک ہو۔ تم ڈرتے ہو۔ تم یوں ہو۔ تم واں ہو۔

کئی بار اس سے کہا کہ میں بالکل نہیں ڈرتا۔ آخر سائیکل تو چلا لیتا ہوں۔ لیکن موٹر سائیکل کس طرح چلاؤں۔ چلانا تو ایک طرف رہا میں

تو اسے ہلا بھی نہیں سکتا۔ نہ یہ پتہ ہے کہ چلانے کے لئے کونسی کمانی گھاتے ہیں اور اگر چل پڑے تو روکتے کس طرح ہیں۔

وہ منہ چڑا کر کہتی۔ ڈاکٹر صاحب تو روز چلانے میں، چلانا سیکھ کیوں نہیں لیتے۔

میں کہتا۔ کوئی سبق ہو تو یاد کر لوں، وہ تو ہینڈل پکڑ کر ایک دہلی سڑی مارتے ہیں اور پھٹ پھٹ کی آواز آنے لگتی ہے۔ پھر نہ جانے کیا کھینچا تانی کرتے ہیں کہ دیکھتے دیکھتے موٹر سائیکل ہوا ہو جاتی ہے۔

تب کہا جاتا کہ تم یہ سب کیوں نہیں کر سکتے۔ بس ڈرتے ہونا! میں سمجھاتا کہ ابھی موٹر سائیکل کے برابر تو ہم خود ہیں۔ بڑے ہو گئے تو موٹر سائیکل چھوڑ پوری موٹر چلایا کریں گے۔ بھلا کبھی ہمارے جتنے بچوں کو موٹر سائیکل پر چڑھتے کہیں دیکھا؟

اس کے جواب میں ایک تصویر پیش کی جاتی۔ ایک موٹر سائیکل کو ایک لڑکا چلا رہا ہے اور ایک لڑکی پیچھے بیٹھی ہے۔ میں بہتیرا کہتا کہ یہ تصویر فرضی ہے۔ یونہی کسی نے کھینچ دی ہے۔ لیکن جواب وہی ملتا کہ بس ڈرپوک ہو!

اختر کے کہنے پر میں طرح طرح کی حماقتیں کر چکا تھا۔ ہم دونوں نے مشورہ کر کے آبا جان کی سنہری گھڑی کیاری میں بودی۔ اختر کا خیال تھا کہ پردے میں پہلے تو ٹنٹھی متی گھڑیاں لگیں گی۔ پھر ٹائم پیس لگیں گے اور جب پردا بڑا ہو کر درخت بن جائے گا تب کلاک لگیں گے۔

لیکن بادبہود ایک ماہ کی دیکھ بھال اور پانی دینے کے کچھ بھی نہ ہوا۔ پھر اس کے مجبور کرنے پر بہادر بننے کے سلسلے میں ابا جان کی بندوق چلا دی۔ جب بندوق چلی تو میں کہیں گرا اور بندوق کہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میری غلیل تک چھین لی گئی۔ اختر کہتی تھی کہ جو چیز جانور کو جا کر لگتی ہے وہ سالم بندوق ہی ہوتی ہے۔ یہ گولی اور چھترے یونہی بناوٹی چیزیں ہیں۔ اُس روز بندوق چلانے پر کچھ بھی ثابت نہ ہو سکا۔ یہ ضرور ہوا کہ بندوق چلنے پر گولی تو خدا جانے کہاں گئی۔ البتہ چھت پر ڈبوں میاں (جو غالباً بتی سے لڑ کر چھت پر دھوپ سینک رہے تھے) تڑپ کر اُچھلے اور ساتھ رکھے ہوئے پانی کے ٹب میں گرے اور وہاں سے اُچھل کر روشن دان میں سے ہوتے ہوئے سیدھے کمرے میں جا گرے جہاں آپا کے پاس ہونے کی خوشی میں پارٹی ہو رہی تھی۔ خدا جانے اُن کی سہیلیوں پر کیا بیتی۔ آپا جان بچہ ناراض ہوئیں، اُن کے رنگ برنگے سیٹیاں بجانے والے پرندے سہم کر رہ گئے اور وہ کمبخت طوطا تو یوں ڈبک گیا جیسے مر ہی گیا ہو۔

پھر پریوں کی بہت سی کہانیاں پڑھنے کے بعد اختر کے کہنے پر ساری رات چھوٹی موٹی اور نرگس کی کلیوں پر پہرہ دینے میں گزار دی۔ ہم وہاں پر یاں پکڑنے گئے تھے۔ اختر کے ماتھے میں ایک چھوٹا سا جال تھا۔ (جس سے ہم تتلیاں پکڑا کرتے تھے) ہم دبے پاؤں پہرہ دیتے رہے۔ جب چاند طلوع ہوا تو ہم اور بھی محتاط ہو گئے۔ اس رات مجھے بڑا ڈر لگا۔ مھنڈی ہوا کے جھونکوں سے سبکیاں آرہی تھیں۔ جب مَرغ کی اذان

سُائی دی تو اپنے اپنے کمروں میں جا ڈہکے۔ صبح صبح یہیں کھانسی بھی ہو گئی اور زکام بھی۔

سہ پہر کو ہم باغ میں کھیل رہے تھے، ایک درخت کے نیچے منشی جی نماز پڑھ رہے تھے۔ اختر کی اور منشی جی کی آپس میں چٹم چوٹ رہتی تھی۔ اختر بولی۔ ”جب کوئی شخص نماز پڑ رہا ہو تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”کیا مطلب۔؟“

”بولی۔“ اب یہ جو منشی جی نماز پڑھ رہے ہیں۔ اگر تم ان کا کان کاٹنا چاہو تو ہرگز نہیں کاٹ سکتے۔“

میں نے کہا۔ ”کاٹ سکتا ہوں۔“ وہ بولی ”بالکل نہیں۔“ میں مُصّر ہوا۔

آخر طے ہوا کہ جب منشی جی اس دفعہ نیت باندھیں، تو میں اُن کا کان کاٹ دوں۔ شرط بھی لگی۔ اختر ددڑ کر چچا جان کی شکاری چھری لے آئی۔ میں نے

اچھی طرح چھری پکڑی اور تاک میں بیٹھ گیا۔ منشی جی سجدے میں گئے۔ اب

جو وہ بیٹھے ہیں تو پیک کر اُن کا کان مضبوطی سے پکڑا اور چھری پھیر دی۔

ادھر کان ہے کہ کٹتا نہیں۔ میں ہوں کہ زور لگا رہا ہوں۔ کیا مجال ہے جو

منشی جی ذرا بھی ہلے ہوں۔ بدستور پڑھتے رہے۔ اختر کے قہقہوں پر دوچار

نہ کر چلے آئے۔ جو دیکھتا ہوں تو چھری اُلٹی پکڑ رکھی ہے۔ نوکروں کو دیکھ کر

ہم وہاں سے بھاگے۔ کتنے دنوں تک ڈرتا رہا کہ اگر چھری کی دھار منشی جی

کے کان پر پھیر دیتا، تو واقعی اُن کا کان میرے ہاتھ میں آ جاتا اور پھر غوٹ

بھی نکلتا۔

ایک روز ہم آپا کے ساتھ سینا گئے۔ جہاں ہم نے کتے بازی کی ایک فلم دیکھی۔ اختر کو مکتا بازی بہت پسند آئی۔ گھر پہنچ کر کہنے لگی آؤ لڑیں۔ مجھے اُن دنوں بُخار آتا تھا۔ وہ ساری گرمیاں پہاڑ پر گزار کر آئی تھی اور خوب سُرخ ہو رہی تھی۔

پہلے تو مال مٹول کی کہ بھلا ایک لڑکی سے کیا لڑوں گا۔ وہ کہنے لگی تم ڈرتے ہو، خیر مکتا بازی ہوئی۔ اُس نے اپنے لمبے لمبے تیز ناخنوں سے میرا چہرہ نوچ لیا اور جب میں نے اُسے پرے دھکیلا تو اُس نے دوڑ کر میری کلائی میں اس بُری طرح کاٹا کہ اب تک نشان موجود ہے پھر جو روئی ہے نوچ کر انا مشکل ہو گیا۔ تتلیوں کے سارے پر، چاکلیٹ سے نکلی ہوئی تصویریں۔ گولیاں۔ جو کچھ میرے پاس تھا سب کچھ اُسے دیا۔ تب جا کر چپ ہوئی۔

میں کچھ ایسا ڈرتا بھی نہیں تھا۔ ایک تو مجھے اختر کے جتوں، بھوتوں کے قصوں نے پریشان کر رکھا تھا۔ صبح سے شام تک طرح طرح کی جھوٹی سیچی کہانیاں سُنا کر کرتی اور میں یقین کر لیتا۔ رات کے گیارہ بجے ہوں گے۔ سب سینڈ شو دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کو اُستانی جی پڑھا کر چلی گئیں۔ کمروں میں ڈر لگتا تھا۔ اس لئے ہم برآمدے میں بیٹھے تھے۔ باہر بڑے زور سے بارش ہو رہی تھی۔ بجلی

چمک رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔

اختر نے ایک کہانی شروع کی۔ ”اندھیری رات تھی۔ ایک بہت ہی ڈراؤنے اور اُجاڑ جنگل سے ایک ٹرین گزر رہی تھی۔ بُری طرح بارش ہو رہی تھی۔ ایک لمبے خطرناک سے ڈبے میں صرف دو آدمی بیٹھے تھے۔“

مجھے ڈر لگنے لگا۔ یہ اختر کبھی خواہ مخواہ ایسی باتیں کرتی ہے۔ مہلاریل کا ڈبہ خطرناک کیسے ہو گیا؟ سوچنے لگا شاید اب یہی ہو گا کہ ایک آدمی دوسرے کی مرمت کرے گا۔ یا چلتی ریل سے باہر پھینک دے گا۔ میں نے اپنی کرسی کھینچ کر اُس کے نزدیک کر لی۔

وہ بڑے اطمینان سے کہانی سنا رہی تھی۔ دونوں آدمی چپ چاپ بیٹھے تھے۔ بجلی زور سے کڑکی۔ ایک آدمی دوسرے سے بولا۔ ”کیوں صاحب آپ بھوت پریت کو مانتے ہیں؟“

دوسرا بولا۔ ”جی نہیں! میں تو نہیں مانتا۔ اور آپ؟“
پہلا بولا۔ ”میں تو مانتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ دھواں بن کر اڑ گیا۔
”دھواں بن کر اڑ گیا؟ کہاں اڑ گیا؟“ میں نے قریب قریب پیچھے ہوسٹے کہا۔

”بھئی غائب ہو گیا۔ دراصل وہ خود بھوت تھا اور آدمی کا بھیس بدلے بیٹھا تھا۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”پھر کیا ہونا تھا۔ وہ بیچارہ ڈبے میں رہ گیا تھا اُس کا جو حال ہوا ہوگا“

ہم بھرتی اندازہ لگا سکتے ہیں۔“

میں نے اپنی کرسی اور نزدیک کھینچ لی۔

وہ ڈراؤنا منہ بنا کر بولی۔ ”اور اگر میں یہاں بیٹھی بیٹھی غائب ہو جاؤں،

بس دھواں بن کر اڑ جاؤں تب؟“

میں نے لپک کر اُسے پکڑ لیا۔ اتنے زور سے دلو چا جیسے وہ سچ مچ اڑ جائے گی۔ وہ کہنے لگی۔ ”اور جوئیں انسان نہ ہوں تو— کچھ اور ہوں؟“

میں اس قدر ڈرا کہ ایسی سردرات میں اتنا پسینہ آیا کہ کپڑے بھیگ گئے۔ مدتوں یہی سوچا کرتا کہ کیا ہو جو یہ اختر کوئی چڑیل وغیرہ ہی ہو۔

ایک رات امی بولیں۔ ”نحفے ذرا اندر سے مارچ اٹھا لاؤ۔ مالی کہیں

باہر جاتے گا۔“

میں بڑا دلیر بن کر اندھیرے کمرے سے مارچ اٹھا لایا۔

اختر بولی۔ ”بڑے بہادر بنے پھرتے ہو۔ وہ کہانی بھی سُنی ہے تم

نے اندھیرے کمرے اور ماچس والی؟“

میں سہم گیا۔ ”کونسی کہانی؟“

”وہی کہ ایک شخص اندھیرے کمرے میں ماچس لینے گیا۔ اندر سخت

تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی نہ دیتا تھا۔ وہ ادھر ادھر ٹٹل رہا تھا کہ

یکلخت اُس کے ہاتھ میں ماچس تھادی گئی!“

”ماچس دے دی۔ کس نے؟“

”نہ جانے کون تھا۔ وہ چیخ کر باہر بھاگا۔ لوگوں نے بہتیرا تلاش

کیا۔ لیکن اندر کوئی نہ تھا۔ لہذا اندھیرے کمرے میں جاتے ہوئے ذرا ہشیار رہنا چاہئے۔“

اس کے بعد مدت تک میں کسی اندھیرے کمرے میں نہیں گھسا۔

آخر اُس کے بار بار کہنے پر تنگ آ کر میں نے تہیہ کر لیا کہ ضرور ایک روز موٹر سائیکل چلاؤں گا۔ اختر کو یقین تھا کہ سارا ڈرتا تک ہے، جب تک موٹر سائیکل چلتی نہیں۔ ایک دفعہ چل پڑے تو بس۔ یوں لگے گا جیسے معمولی سائیکل چلا رہے ہوں۔

جب کبھی ڈاکٹر صاحب موٹر سائیکل چلاتے تو ہم بڑے غور سے سارا عمل دیکھتے۔ شروع شروع کی باتیں تو سمجھ میں آ جاتیں۔ لیکن بعد میں جو تین چار حرکتیں اکٹھی کر جاتے۔ اُن کا کچھ پتہ نہ چلتا۔

اختر بولی۔ ”تم پوچھ کیوں نہیں لیتے ڈاکٹر صاحب سے۔“
میں نے کہا۔ ”بتائیں گے نہیں، اور ممکن ہے کہ ناراض ہو جائیں اور پینے کو سخت کڑوی کیسی دوائیاں دیں۔“
بولی۔ ”تم ڈرپوک ہو۔“

میں جھپٹا اٹھا اور سینہ پھٹا کر بولا۔ ”آج ڈاکٹر صاحب سے ضرور پوچھوں گا۔“

ڈاکٹر صاحب اندر سے نکلے۔ میں برآمدے میں کھڑا تھا۔ اُن کے ساتھ باہر تک گیا۔ اُنھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میں نے سلام کیا۔

تسکون

دے کر بھیج دیا گیا۔ لڑکوں نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا، دھمکایا، چمکارا، تفتیں کیں۔ لیکن میں چل گیا کہ اب سیٹج پر نہیں جاؤں گا۔ مجھے پارٹ یاد نہیں، باہر لوگ شور مچا رہے تھے۔ آخر تنگ آ کر شیطان بولے۔ ”تمہاری سزا یہ ہے کہ تم خود سیٹج پر جا کر اُن سے کہو کہ حضرات مجھے معاف کیجئے۔ میں اپنا پارٹ بھول گیا ہوں۔“

اُنھوں نے دھکیل کر مجھے سیٹج پر لا کھڑا کیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہوں۔ پھر یکایک کچھ سُوجھ گیا اور میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”خوانینِ حضرات! یہ جو کچھ آپ نے دیکھا۔ محض نمونہ تھا۔ جسے عموماً ٹریلر کہا جاتا ہے۔ پورا ڈرامہ آپ کو پھر کبھی دکھایا جائے گا۔ اسی ٹریلر سے امتحان لگالیجئے کہ اصل چیز کتنی زور دار ہوگی۔“

لوگ ہنسنے لگے۔ لیکن پرنسپل صاحب کے بلند اور دیر پا قہقہے سارے غل غپاڑے پر فوقیت رکھتے تھے اور ان کی مونچھیں بجلی کی روشنی میں بہت پیاری لگ رہی تھیں۔

آخر میں نے شیطان کو ساری بات بتادی۔ وہ بہت ہنسے کہنے لگے۔ ”کیا واقعی تمہیں محبت ہو گئی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں کچھ کچھ ہو گئی ہے۔“

بولے ”ان کا نام کیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”پتہ نہیں!“

پوچھا۔ ”رہتی کہاں ہیں؟“

سارھے چھ

”یہ بھی پتہ نہیں! — البتہ اُن کی کار کا نمبر زبانی یاد ہے۔!“

”کبھی بات کی ہے؟“

”نہیں تو!“ میں نے سچ کہہ دیا۔

”ان کے آبا کی تعریف؟“

”اچھی طرح تو پتہ نہیں، لیکن کچھ اندیشہ سا ہے کہ کہیں پرنسپل صاحب

ہی نہ ہوں!“

بولے۔ ”لاحول ولا قوۃ! اندیشہ سا ہے۔ اور جو پرنسپل صاحب نہ

ہوتے پھر؟ تم تو خراب و غیرہ کی قسم کے انسانوں کو بھی مات کر گئے، ایسا عشق

تو ہوا کرتا تھا، کہیں سن سولہ سو — سولہ سو پچیس میں! یہ خواہ مخواہ کی

محبت تب ہوا کرتی تھی جب اس ملک میں لڑکیاں نہیں تھیں۔ میرا مطلب

ہے سارا دن چھٹی بیٹھی رہتی تھیں۔ کہیں کسی کو اتفاق سے دیکھ پایا اور فوراً

محبت شروع کر دی۔ اور اب — آج کل تو خدا کا فضل ہے۔ اس زمانے

میں اس قسم کے دقیانوسی خیالات بالکل بے موسم ہیں۔

”مجھے تو ہر رات اُن کے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ خوابوں میں ان سے

باتیں کرتا رہتا ہوں۔“

”خوب! تو خواب دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں تمہارا قصور نہیں۔ اگر

رات کو دسترخوان پر ذرا دیر لگا دی جاتے تو پھر خواب نہیں نظر آتے گے تو

اور کیا ہوگا۔ ذرا بھدک رکھ کر کہا، سمجھو۔ تب دیکھیں گے کیا نظر آتا ہے۔

مجھے تو سو کر ذرا سُدھ نہیں رہتی۔ صبح حجام ہی جگاتا ہے۔ کہیں پریاں نہیں

جگاتیں۔“ وہ بولے۔

”آج کل تو تقریباً ہر روز انھیں دیکھتا ہوں۔ اُسی موڑ پر۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا کرتی ہیں۔ اور۔!“

”تمہاری ہی ہمت ہے جو اتنی گرمیوں میں محبت کر لیتے ہو، مجھے تو ان دنوں محبت کا نام سُنتے ہی پسینہ آ جاتا ہے، میری مانو تو اپنی اس محبت کو کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دو۔ تین چار مہینوں کی بات ہے۔ موسم خوشگوار ہو جائے گا۔ تب جو مرضی آئے کرنا۔“

میں نے ایک سرد آہ بھری اور چھت کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”رونی ! تم کیسی باتیں کر رہے ہو آج؟ محبت بھی کہیں ملتوی ہونی ہے بھلا؟۔ عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب وغیرہ وغیرہ۔“

”میرا ذاتی نظریہ تو یہی ہے کہ ایک تندرست انسان کو محبت کبھی نہیں کرنی چاہئے۔ آخر کوئی ٹیک بھی ہے اس میں؟ خواہ مخواہ کسی کے متعلق سوچتے رہو، خواہ وہ تمہیں جانتا ہی نہ ہو۔ بھلا کس فارمولے سے ثابت ہوتا ہے کہ جسے تم چاہو وہ بھی تمہیں چاہے۔ میاں یہ سب من گھڑت قصے ہیں۔ اگر جان بوجھ کر خطی بننا چاہتے ہو تو بسم اللہ کہئے جاؤ محبت ہمارے رائے تو یہی ہے کہ صبر کر لو۔“

مجھے غصہ آیا۔ یہ شخص ہمیشہ مسخرہ بنا رہتا ہے۔

”تم بالکل خشک انسان ہو، بلکہ گرم خشک ہو۔ بالکل غیر رومانی قسم کے۔ تم سے ایسی باتیں کرنی فضول ہیں۔ تم ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔“ میں نے

ساڑھے چھ

جھٹک کر کہا۔

”اور تم بہت سمجھ سکتے ہو۔ کلم از کم تمہیں اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ ایک چھ فٹ کے تندرست انسان کو کوئی حق نہیں کہ وہ محبت کرے اور اس صورت میں جب کہ وہ صبح سے شام تک ورزش کرتا ہو۔ تمہارا صحت ہرگز محبت کے قابل نہیں۔ تم تو جا کر ورزش کرو۔“ میں غصے سے تلملا اٹھا اور بغیر ایک لفظ کہے واپس چلا آیا۔

لیکایک وہ خاتون غائب ہو گئیں، اگلے ہفتے پتہ چلا کہ پرنسپل صاحب تبادلہ ہو گیا ہے اور وہ خاتون واقعی اُن کی صاحبزادی تھیں۔ بڑا افسوس دن بھر سوچتا رہا۔ اگر پتہ ہوتا کہ یہ اُن کی صاحبزادی ہیں تو یوں ہاتھ پر ہا دھرے نہ بیٹھا رہتا۔ اب تو وہ سب کہیں دُور چلے گئے ہوں گے۔ شیطان کے پاس گیا۔ ساری بات بتائی پوچھا اب کیا کیا جائے۔

وہ بولے۔ ”بھلے آدمی! عقل کے ناخن لے، نہ کبھی بات کی جتنی نہ خواہ مخواہ افسوس کرنے سے فائدہ۔ دُنیا بہت وسیع ہے، اور حادثے بہتر ہوتے رہتے ہیں۔ کیا پتہ کل تجھے کوئی اور چیز نظر آجائے اُس سے بہتر باقی رہا تبادلہ سو اس پر کسی کا زور نہیں، دُنیا کا دستور ہے۔ ہم نے کیا تو بھی کر۔ انا اللہ۔“

”آہ پرنسپل صاحب!“ میں نے ایک سرد آہ بھری۔ ان دنوں یہ بڑی آسانی سے بھر سکتا تھا۔ کافی پریکٹس تھی۔

”اب آہ پرنسپل صاحب یا مائے پرنسپل صاحب کہنے سے کوئی

شگوفے

میں۔ پرنسپل صاحب کی ذات سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ویسے وہ کچھ نئے دُور بھی نہیں گئے اور اگر تم ان کی نگاہوں میں آگئے ہو تو وہ تمہیں نہیں بھولیں گے اور شاید کبھی یاد ہی فرمائیں۔“
میں سوچنے لگا شاید یاد ہی فرمائیں۔

اور سچ مچ اُنہوں نے یاد فرمالیا۔ ایک ٹورنامنٹ کے سلسلے میں رعوکیا اور یہ بھی لکھا کہ کوکھی میں کافی جگہ ہے۔ میرے پاس ٹھہرنا۔

میں بہت خوش ہوا۔ اُس روز خوب اکڑ کر چلا۔ مٹھیاں بھینچ کر سینہ نکال کر۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اب بہت جلد اُن خاتون کا اچھی طرح سے مُنہ چڑ اڈل گا اور اُنہیں سلام کا جواب بھی دینا پڑے گا۔ میں ایک ذمہ دار اور عقلمند لڑکا ہوں۔ لوگ مجھے بہت اچھا سمجھتے ہیں۔ تب ہی تو پرنسپل صاحب محض دو تین مرتبہ دیکھنے کے بعد اتنے متاثر ہو گئے ورنہ شیطان بھی تو ہیں۔ سانولے رنگ کے۔ شتر مرغ کی قسم کے انسان۔ چہرے پر نہ ذہانت ہے نہ کچھ اور، بالکل کورے دکھائی دیتے ہیں۔ اُنہیں تو کسی نے پسند نہیں کیا۔ شاید پرنسپل صاحب اس دن مجھے لڑتا دیکھ کر خوش ہو گئے اُنہوں نے ضرور میرا نام اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ بس مرعوب ہو گئے ہیں۔ ولایت میں تو کھلاڑیوں کی بہت قدر ہوتی ہے۔ کیا سپرٹ دکھائی ہے اُنہوں نے واللہ! اور پھر میں ہوں کس سے کم، ایم۔ اے کا طالب علم ہمیشہ چوٹی

ساڑھے چھ

کے لڑکوں میں شمار ہوتا ہوں۔ چند مہینوں میں ایم۔ اے پاس کر لوں گا۔ پھر مقابلے کے امتحان میں شریک ہوں گا۔

تب سب کو پتہ چلے گا کہ میں محض ایک کھلاڑی ہی نہیں ہوں۔ مجھ میں کئی اور خوبیاں بھی ہیں۔ جن کے سامنے پرنسپل صاحب جیسے نقاد نے ہتھیار ڈال دیئے۔

میں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ پانچ چھ روز کے بعد جانا تھا۔ متوقع گفتگو کی سکیم بنائی کہ وہ تقریباً کیسی کیسی باتیں کر سکتے ہیں اور اُنکے دندان شکن جواب کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ اُن کے سامنے گھبراتے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ سپورٹسین کبھی گھبراتے ہیں کیا؟

شیطان نے بڑی تمیزی دکھائی۔ مبارک باد تک نہ دی۔ میں نے سوچا رشک آرہا ہو گا جناب کو۔ جس شہر میں پرنسپل صاحب رہتے تھے دیر اتفاق سے شیطان چند دنوں کی چھٹی پر جا رہے تھے۔ طے ہوا کہ اکٹھے چلیں گے۔ چنانچہ ہم روانہ ہوئے۔ میں نے دھاریوں والا بہت اچھے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور ویسے ہی رنگ کی پھولدار بولنگا رکھی تھی، بوکچہ تنگ تھی۔ اس کا ایک سخت ساقصہ بُری طرح چمچ رہا تھا۔ میری گردن بالکل اکڑی ہوئی تھی۔ ذرا سا بھی ہلانہ سکتا تھا۔ بار بار اُسے ڈھیلا کرتا اور وہ گردن میں پھر پیوست ہو جاتی۔

شیطان بولے۔ "اگر میں تمہاری جگہ ہوں تو اس کمبخت کو پھینک دو ایک طرف، آخر کس حکیم نے کہا ہے کہ ضرور بولگائی جائے۔" میں نے یہی سو

شگرف

کہ حد سے جل رہے ہیں۔

”اور اپنی طرف سے دل میں خوش ہو رہے ہو گے بڑے تیر مارنے جارہے ہو“ وہ بولے اور میرا شبہ یقین میں تبدیل ہو گیا۔ میں شیطان کے عزیزوں کے ہاں بٹھرا۔ اگلے روز پرنسپل صاحب سے ملنا تھا۔ لباس کا انتخاب کرنے لگا۔ شیطان کی راتے لی۔ وہ بولے۔ ”کچھ پہن لو۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”فرق کیوں نہیں پڑے گا۔ میرے خیال میں تو یہ دھاریوں والا سوٹ اور یہ بوسب سے اچھی رہے گی۔“

”خواہ نیکر پہن کر چلے جاؤ یا تہہ باندھ لو، اب کوئی فرق نہیں پڑیگا۔“

”آخر کیوں نہیں پڑے گا۔ لباس کی تمیز بھی تو کوئی چیز ہے۔“

”لباس کا خیال چھوڑو، وہ پہلے سے فیصلہ کر چکے ہیں۔“

”تو گویا مجھے تفریحاً بلایا گیا ہے۔“

”یقیناً!“

”رونی! تم ایک زود رنج اور چڑچڑے انسان ہو۔ پہلے میرا خیال تھا کہ تمہیں رشک آ رہا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ حد سے تمہارا برا حال ہے۔ اور انھوں نے ایک زوردار فقہ لگایا۔“

”آخر ہنسنے کی کیا بات ہے اس میں؟“ میں نے پوچھا۔

”پرنسپل صاحب کو جو کچھ چاہئے وہ تمہارے ہاں موجود ہے۔ تمہارے

ابا کی تنخواہ کافی ہے۔ تمہارے ہاں اچھی سی کار ہے۔ تمہاری جائیداد بھی ہے

ساڑھے چھ

بالکل مختصر سا کنبہ ہے۔ بس ان سب باتوں کی جانچ پڑتال کے بعد پرنسپل صاحب راضی ہو گئے ہیں اور تم خواہ مخواہ بیچ میں تاؤ کھا رہے ہو۔ وہ بوٹے

”لیکن کار تو آبا کی ہے۔ اس سے میرا تعلق؟“

”کچھ بھی سمجھ لو۔ لیکن انھیں تو یہی چاہئے تھا۔“

”اور اگر یہ سب باتیں ہم میں نہ ہوتیں تو؟“

”تو یہی کہ تم دن رات کتے بازی کرتے۔ تیرنے میں کپوں کی گھڑی جیت لیتے۔ ایم، اے چھوڑ کچھ اور بھی کر لیتے۔ تب بھی تمہیں کوئی نہ چھپتا۔“

”جھوٹ ہے۔“ میں نے جوش سے کہا۔ ”بھلا آبا کی چیزوں کا مجھ سے

تعلق؟ میرے پاس تو اپنی قابلیت ہے بلند ارادے ہیں، ہمت ہے!“

”تمہارے پاس سب کچھ ہوگا۔ لیکن تمہارا انتخاب محض کار و غیرہ کی

وجہ سے ہوا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں غموں کی یونہی ہوا کرتا ہے۔“

مجھے بڑا غصہ آیا۔ جی چاہا کہ شیطان کو ناک آؤٹ کر دوں۔ یونہی انٹ

h.

سنٹ ہانک رہے ہیں۔

”پرنسپل صاحب بہت بڑے عالم ہیں۔ نہایت وسیع خیالات کے

انسان ہیں، تم اُن پر اتنا بڑا الزام لگا رہے ہو، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ

مجھے محض میری خوبیوں کی وجہ سے پسند کرتے ہیں۔“

”خیر، تم مُصر ہو تو کرتے ہو گے۔“

مجھے پھر غصہ آگیا۔ ”آخر کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟“

”ثبوت؟ — ثبوت یہی ہے کہ کل پرنسپل صاحب سے اپنے گھر کے

شکر خفہ

”متعلق ذرا اکھڑی اکھڑی باتیں تو کر کے دیکھو۔ پھر پتہ چل جائے گا۔“

”اور جو تمہاری باتیں غلط ثابت ہوئیں تو؟“

”تو جو چور کی سزا، وہ میری سزا، عمر بھر تمہیں ایک نصیحت کر جاؤں

تو نام بدل دینا۔“

میں سوچنے بیٹھ گیا۔ بتانے کو تو غلط باتیں بتا دوں۔ لیکن اس کے

نتائج نہ جانے کیسے نکلیں، کہیں آبا کو پتہ نہ چل جائے۔

”پرنسپل صاحب تو آبا سے ملے ہوں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں! صرف چچا جان سے ملے تھے۔ وہ بھی سرسری طور پر۔“

ذرا سی مزید بحث کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ پرنسپل صاحب کو

غلط باتیں بتاؤں گا! مجھے پختہ یقین تھا کہ وہ ان باتوں کا اتنا سا بھی خیال نہیں

کریں گے۔ وہ مجھے پسند کرتے ہیں، بھلا اس میں موٹر اور جائداد کا کیا سوال ہے۔

شیطان مجھ سے ہاتھ ملا کر بولے۔ ”آزمائش شرط ہے۔“

شام کو اُن کے ہاں جانا تھا۔ میں نے وہی دھاریوں والا سوٹ پہنا، پھولدار

بو لگائی۔ جس نے میری گردن کو جکڑ کر رکھ دیا۔ پرنسپل صاحب نے اپنی کار

بھیجی تھی۔ میں نے شیطان کو بھی ساتھ گھسیٹا کہ چلو تم بھی یہ تماشا دیکھ لو۔

مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ شیطان بہانے سے اُن کی لائبریری میں

گھس گئے جو ساتھ ہی تھی۔ میں بڑی حیرانی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

نین ریڈیور رکھے تھے۔ ایک کام کا ہوگا۔ دو شاید بگڑے ہوئے ہوں۔ چھوٹے

چھوٹے کتے۔ بلیاں، طوطے، بُت، عجیب و غریب تصویریں۔ کارنسیں،

ساڑھے چھ

میزیں، الماریاں، سب کی سب ایسی چیزوں سے لدی ہوئی تھیں۔ لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ آج ہی رکھا گیا ہے۔

خوشبو کی ایک زبردست لپٹ آئی اور پرنسپل صاحب داخل ہوئے۔

ایک بہت ہی چمکیلے سوٹ میں ملبوس، بال بہت اچھے بنے ہوئے تھے۔

بلکہ استری کئے گئے تھے۔ اُن کی دونوں نوکدار بڑھیا مونچھیں بجلی کی نیز روشنی

میں نگاہوں کو خیرہ کئے دیتی تھیں۔ وہ حرب معمول چھت کی جانب اشارہ

کر رہی تھیں جیسے کسی ٹائم پیس میں گیارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے ہوں۔ زبانی

انہوں نے روغن مونچھ استعمال کیا تھا یا کوئی خاص مونچھ کریم لگا کر آئے تھے۔

مجھے دیکھ کر تو وہ جیسے آپے سے باہر ہو گئے۔ مسکرائے، ہنسنے، چلائے،

میرے ہاتھ کو دس بارس پاور سے یوں بھینچا کہ جیسے توڑ کر دم لیں گے۔ اُن کا

میک اپ دیکھ دیکھ کر میں حیران ہو رہا تھا۔ بھلا یہ انٹرویو کس کا ہو رہا ہے میرا

یا اُن کا؟

بولے: کم از کم ایک ماہ تو تم یہاں ضرور ٹھہرو گے، نہیں؟ — واہ یہ

بھی کوئی بات ہے۔ تمہیں جانے کون دیتا ہے۔ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا

غیر حاضری لگے گی؟ — لگ جائے، کیا پروا ہے؟ کھیلنے کے لئے یہاں بیشمار

کلب ہیں، کرکٹ ہے، باکسنگ ہے، ٹینس ہے، سب کچھ ہے؟

جس تیز رفتاری سے وہ باتیں کر رہے تھے۔ میں اُن سے مرعوب ہوتا

جار رہا تھا۔ وہ کم بخت بو مجھے بُری طرح چمبھ رہی تھی۔ اُسے ٹھیک کرتے کرتے

تنگ آچلا تھا۔

شکر خفے

میں نے چھوڑی کلب میں تھیں کھیلنے دیکھا۔ پروفیسر گراؤ پتو تنہا ہی بڑی تعریف کر رہے تھے۔ اخباروں میں کتنی مرتبہ تمہارے متعلق پڑھا۔ خوب! تو تم ایم۔ اے کا امتحان دے رہے ہو۔ ہم نے تمہاری لیاقت کی شہرت بھی سنی ہے۔ یہ ساری خوبیاں تم میں اکٹھی کیسے ہو گئیں؟ ایم۔ اے کوئی مذاق تھوڑا ہی ہے اور پھر ذہین لڑکے تو کھیلنے میں عموماً پھسڈی ہوتے ہیں۔ نہ جانے تم یہ سب کچھ کس طرح کر لیتے ہو؟

انہوں نے جوش میں آکر میرے کندھے مٹل ڈالے۔

میں سوچنے لگا کہ شیطان بالکل جھوٹ بولتے تھے۔ پرنسپل صاحب تو میری خوبیاں بیان کر رہے ہیں، بھلا انہوں نے ہمارے گھر کے متعلق بھی پوچھا ہے کہیں، مجھے شرمندہ ہونا چاہئے۔ تو بہ تو بہ کیسی کیسی فضول باتیں میں ان سے منسوب کرتا رہا ہوں۔ استغفر اللہ!

”تو کم از کم ایک ماہ یہاں رہو گے، مجھے فقط دو مرتبہ کار کی ضرورت پڑتی ہے۔ دن بھر یہ یونہی کھڑی رہتی ہے۔ تم اسے خوب لٹے پھرتا۔ یہ کار کیسی ہے؟ — یہی جس میں تم آئے ہو۔ بیوک کا نیا ماڈل ہے۔ پہلے ہمارے ہاں ڈاج بنتی۔ وہ اچھی نہ بنتی۔ جی چاہا کہ پونٹیک لے لوں، سٹوڈی بیکر پر بھی دل لپایا۔ بڑی عمدہ کار ہوتی ہے۔ لیکن آخر یہی لے لی — بھلا تمہارے ہاں کونسی کار ہے؟“ میں چونک پڑا۔ سوچنے لگا کہ اب کیا کہوں۔ بو زور سے چیخا۔ میں نے جلدی سے اُسے ٹھیک کیا۔ پھر عجیب سا منہ بنا کر کہا۔ ”ہمارے ہاں؟ — ہمارے ہاں تو کوئی کار نہیں!“

ساڑھے چھ

”کیا کہا؟ کوئی کار نہیں؟“

”جی نہیں؟ — ہمارے ہاں کوئی کار تھی ہی نہیں، البتہ مربعوں پر چند

اونٹ ضرور ہیں۔“

”لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ تمہارے ہاں کار ہے۔“

”انھوں نے یوں منہ بنایا کہ جیسے بچے کو نین مکسچر پی کر بنایا کرتے ہیں۔

”جی یونہی کسی نے غلط بتا دیا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”اُن کی دونوں تنی ہوئی تاڈ شدہ مونچھیں ایک لمبت ڈھیلی پڑ گئیں اور

اب وہ بالکل خط منقیم بنا رہی تھیں جیسے گھڑی کی سوتیاں سوا نو بجے ہوتی

ہیں۔

”آپ خاموش ہو گئے۔“ میں نے مودبانہ کہا۔ ”کیا ہوا کار ہوئی نہ

ہوئی اُس سے فرق کیا پڑتا ہے؟“

”ہاں! ہاں کوئی بات نہیں۔ وہ تو یونہی پوچھ رہا تھا۔ لیکن مجھے —

مجھے کسی نے بتایا تھا کہ تمہارے ہاں کار ہے۔ خیر!“

”اُن کا بوش و خروش کچھ کم ہو گیا تھا۔ اپنی انگلیاں چٹھانے لگے۔

پھر بولے۔

”آج کل آبا کہاں ہیں؟“

”پنشن ہو گئی ہے۔ کشمیر گئے ہوئے ہیں۔“ حالانکہ پنشن ملنے میں ابھی

کئی سال باقی تھے۔

”افو! پنشن پر ہیں۔ لیکن مجھ سے کسی نے کہا تھا ابھی سروس

شکوفے

میں ہیں۔

”یونہی کسی نے کہہ دیا ہوگا۔“

پرنسپل صاحب نے پھر بہت بُرا منہ بنایا۔

”ہاں ہاں! تمہاری زمینیں!“

”اچھا! ماموں جان کے مربعوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ دراصل وہ ہمارے

نہیں ساری جائیداد ماموں جان کی ہے۔

”وہ زمینیں بھی تمہاری نہیں؟“ وہ چلا کر بولے۔ ”غضب خدا کا۔ تو کیا

سچ مچ وہ کسی اور کی ہیں؟“

”جی ہاں! سچ مچ!! نہ جانے کس نے آپ کو ساری باتیں غلط بتا دیں۔“

”لاحول ولا قوۃ! کار والی بات بھی غلط۔ سروس والی بھی غلط، جائیداد

والی بھی غلط، لاحول ولا قوۃ!“

”میں اس مرتبہ ایم، اے کے امتحان کی تیاری۔!“ میں نے شروع کیا۔

”لاحول۔ ابھی ایم، اے کے امتحان میں بڑے دن ہیں، اسے چھوڑو

تمہارے چھوٹے بھائی کہاں ہیں آج کل؟“

”کون سے چھوٹے بھائی کا ذکر کر رہے ہیں آپ؟“ میں نے معصومیت

سے پوچھا۔

”لاحول ولا۔ تمہارے چھوٹے بھائی کا۔!“

”جناب ہم کل آٹھ بھائی ہیں!“ میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا

”انہوں نے ایک پیسج ماری۔“ آٹھ بھائی ہیں؟ لیکن مجھے تو بتایا گیا تھا۔

ساڑھے چھ

کہ۔ (زور سے) تو گویا سچ مچ آٹھ بھائی ہیں۔ اور کار والی بات بھی غلط ہے؟۔ لاحول ولا قوۃ“

پرنسپل صاحب کا چہرہ دفعۃً اُتر گیا۔ ان کی چمک دار مونچھیں اور نرم ہو گئیں اور یک لخت ڈھلک سی گئیں، جیسے گھڑی کی سوئیاں آٹھ بج کر بیس منٹ پر آتی ہیں۔

”تو گویا مجھے بالکل غلط باتیں بتائی گئی ہیں۔ یقین نہیں آتا۔ لاحول ولا۔ سچ مچ تمہارے ہاں کار نہیں ہے؟ عجب تماشا ہے۔ مجھے تو بڑے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ!“

”قبلہ گستاخی معاف! آپ پانچ منٹ میں سات آٹھ مرتبہ لاحول پڑھ گئے ہیں۔!“

”اوہو! خیال نہیں رہا۔ لیکن سوچو تو سہی ذرا، سب کی سب باتیں

غلط بتائی گئیں“

پرنسپل صاحب نے صاف ظاہر کر دیا تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔

میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ بُرا نہ مانسے۔ مجھ میں نقائص نکالنے

ببلا آبا جان کی کار ہو یا ان کی جائداد، اس سے میری خوبیوں میں تو کوئی

اضافہ نہیں ہو سکتا۔ میں ایم، اے کا امتحان دینے والا ہوں، ضرور پاس

ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد کئی مقابلوں میں شامل ہو سکتا ہوں۔ ابھی ابھی آپ

نے مجھے ذہین کہا ہے، میرے ارادے بلند ہیں۔ مجھ میں ہمت ہے۔ آپ

میرے پڑانے سرٹیفکیٹ دیکھ لیجئے، اور وہ۔!“

ننگونے

”ہاں یہ سب ٹھیک ہے۔ خدا کرے تم کامیاب ہو جاؤ۔ لیکن مجھے تو ایک معتبر ذریعے سے معلوم ہوا تھا کہ تمہارے ہاں — ویسے تم بھی سچ کہہ رہے ہو، لیکن وہ — یعنی کہ — مجھے سچ غلط بتایا گیا۔“

”آپ کار کا ذکر بار بار کرتے ہیں، سو میں سچ عرض کرتا ہوں کہ چند ہی سالوں میں ایک چھوڑ دو کاریں لے لوں گا اور وہ میری ہوں گی۔ آپ میرے متعلق بھی تو کچھ پوچھئے۔ آپ نے اکثر اخباروں میں میرے متعلق پڑھا ہوگا۔“

”اُسے چھوڑو! کھیل کود بیکار چیز ہے، یہ ڈراما وغیرہ مسخروں کا کام ہے باقی رہا ایم۔ اے میں پڑھنا، سو یہ ایک معمولی سی بات ہے۔ ہزاروں لڑکے ایم۔ اے میں پڑھتے ہیں۔“ وہ ہزار ہو کر بولے۔

”لیکن جناب میرے پاس حوصلہ ہے، اُمیدیں ہیں، مستقل مزاجی ہے، بلذا ارادے ہیں۔!“

”ہوں گے! — خدا کرے ہوں —! نہ جانے مجھے یہ باتیں کیوں غلط بتائی گئیں۔ اگر کہیں مجھے پہلے پتہ چل جاتا کہ تمہارے ہاں —“

اس کے بعد وہ کچھ دیر تک کمرے میں بیٹھے، اُنہوں نے ایک سگریٹ پیا (اکیلے اکیلے) کچھ دیر سُر جھجکائے سوچتے رہے۔ تین چار مرتبہ مجھے دیکھا بھی۔ دیر تک مراقبہ میں رہے۔ پھر بولے۔ ”میں کل کہیں باہر جا رہا ہوں۔ بڑا ضروری کام ہے۔ کئی روز تک نہ آسکوں گا۔ تم یہاں اکیلے اُداس ہو جاؤ گے۔ ویسے تمہارا ارادہ کب ہے واپس جانے کا؟“

”چلا جاؤں گا۔!“

ساڑھے چھ

”ہاں میں کم از کم ہفتہ بھر باہر رہوں گا۔ یہاں ننھا ہوگا۔ اُس سے تمہارا کیا جی بہلے گا۔ پھر تمہاری غیر حاضریاں بھی لگ رہی ہیں — اچھا تو بہت دیر ہو گئی کہو تو موٹر نکلو ا دوں۔ ویسے راستہ لمبا تو نہیں ہے، کل دس پندرہ منٹ کا ہے۔ میرے خیال میں پیدل بہتر رہے گا۔“

”اچھا۔!“

اُنھوں نے ایک ڈھیلا سا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ ہاتھ ملا کر بلکہ ہاتھ چھو آ کر میں نے موڈ بانہ سلام عرض کیا اور چل پڑا۔

دروازے سے جو مڑ کر دیکھتا ہوں تو وہ دونوں نوک دار مونچھیں بالکل لٹک رہی تھیں۔

پرنسپل صاحب کی بڑھیا مونچھوں میں ساڑھے چھ بج چکے تھے۔

دروازے پر شیطان ملے ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگے، بر ایک مرتبہ پھر چٹھی، اس دفعہ میں نے اُسے نوچ کر پرنسپل صاحب کے میدان میں پھینک دیا۔

کوٹھی کے دروازے پر شیطان نے ایک زبردست فلک شگاف قہقہہ لگایا اور مجھے بھی اُن کا ساتھ دینا پڑا۔ ہم کتنے زور سے ہنسنے؟ — اس کا اندازہ تو نہیں، البتہ آس پاس کے درختوں پر جتنے پرندے بسیرا کر رہے تھے وہ سب کے سب اڑ گئے۔

ان باتوں کو ایک عرصہ گزر گیا ہے۔ اب کسی موٹر پر گزرتی ہوئی کار کو دیکھ کر ہرگز نہیں بھڑتا۔ کسی خاتون کو دیکھ کر اگر میرے بالوں پر کھٹی بیٹی ہو تب بھی

تنگوے

نہیں اڑاتا۔ نہ کبھی کسی خاتون کو سلام کرنے کی کوشش کرتا ہوں، رات کو ہمیشہ جھوک رکھ کر سوتا ہوں۔

اور جب کبھی کھیل کود کے بعد زیادہ تھک جاتا ہوں تو آنکھیں منہ سے لگتی ہیں۔ غنودگی سی طاری ہو جاتی ہے۔ پرانی یادیں تازہ ہونے لگتی ہیں۔ نظروں کے سامنے سیاہی اور سفیدی کے ٹکڑے ناچنے لگتے ہیں۔ کچھ تصویریں بن جاتی ہیں۔ پھر وہ متحرک ہو جاتی ہیں۔

نب سامنے رکھے ہوئے ٹائٹم پیس کے گرد ایک بال بن جاتا ہے۔
شام کو ساڑھے چھ بجے مجھے ایک جوڑی بڑھیا، نوکر، چنبیلی، تانوسہ
مونچھیں یاد آ جاتی ہیں۔ جن پر پہلے گیارہ بج کر پانچ منٹ تھے۔ پھر سوانوار
اسی طرح اخیر میں ساڑھے چھ بج گئے تھے۔

میرا مہی

یہ نہیں ضد کی میں نے، اور بعد میں اپنی حماقت پر ہنسی بھی آئی، گرمی کا یہ حال کہ الامان، سب کے سب پہاڑ پر جا رہے ہیں اور میں ہوں کہ بٹھرنے کے لئے چل رہا ہوں۔ اس لئے کہ پاگل خانے میں ہماری چند کلاسیں باقی تھیں۔ ہمیں دماغی بیماریوں پر لیکچر دیئے گئے تھے۔ پروفیسر صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ ہمیں پاگل خانہ دکھائیں گے۔ پاگلوں کو دیکھنے کا مجھے بڑا شوق تھا۔ سارا سارا دن یہی سوچتا رہتا کہ پاگل کیسے ہوتے ہوں گے؟

ویسے کلاسیں پہلے ہی ہو جاتیں، لیکن کسی نہ کسی بہانے ملتوی ہوتی رہیں، حتیٰ کہ بُری طرح گرمی پڑنے لگی۔ سب پہاڑ پر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن میں اڑا رہا کہ کلاسوں کے بعد آؤں گا۔ خوب مذاق اڑایا گیا کہ پاگلوں کو دیکھنے کے لئے بٹھہر رہا ہے، ذرا خیر کرے۔

جب انہوں نے دیکھا کہ یہ نہیں مانتا تو اجازت دے دی اور چلتے ہوئے ہدایت کی۔

کلاسوں کے بعد فوراً ہی آجانا، تمہاری حرکتوں سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں

”تمہیں وہاں کی آب و ہوا پسند نہ آجائے۔“

وہ سب چلے گئے۔ ادھر انتظار شروع ہو گیا۔ آخر خدا خدا کر کے وہ دن طلوع ہوا جس کا مدت سے انتظار تھا۔ ہم سب پاگل خانے پہنچے وہاں ہیں ”آداب پاگل خانہ“ پر مختصر سائیکچر دیا گیا اور اس کے بعد پاگل دکھائے گئے۔ ہنستے ہنستے ہمارے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

پاگل کیسے عجیب ہوتے ہیں۔ ابھی جینیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ابھی کھکھلا کر ہنس دیں گے۔ کبھی فوراً سنجیدہ ہو جائیں گے۔ کوئی شعر پڑھ رہا ہے۔ کوئی پکے راگ گار رہا ہے۔ تقریباً سارے پاگل پکے راگ گاتے تھے کیونکہ ہماری سمجھ میں ایک گانا بھی نہ آیا۔ اس روز ہماری کلاس بہت جلد ختم ہو گئی۔ راستے بھر ہم خدا کا شکر ادا کرتے آتے جس نے ہمیں ذی ہوش بنایا۔ اگر خدا نخواستہ پاگل ہوتے تو کیا ہونا؟ رونگٹے کھڑے ہوتے تھے اس خیال پر۔

اگلے روز پھر وہیں گئے۔ ایک صاحب بڑی مسمی صورت بنائے ہوئے آئے اور چپکے سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلے تو ان کی بڑی تعریفیں کیں۔ پھر پوچھا — ”تمہارا کیا نام ہے؟“

انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اسی لمبے میں کہا — ”تمہارا کیا نام ہے؟“

ڈاکٹر صاحب ہنسنے اور بولے — ”تم گھر جاؤ گے؟“

انہوں نے بڑی متانت سے جواب دیا — ”اور تم گھر جاؤ گے؟“

لڑکے سننے لگے۔

ڈاکٹر صاحب ذرا سنجیدہ ہو کر بولے — ”بیوقوف سوالوں کا جواب دو“

”انہوں نے بھی اسی انداز سے کہا — ”بے وقوف سوالوں کا جواب دو۔“
لڑکے قہقہے لگانے لگے۔

ڈاکٹر صاحب بخا ہو کر بولے۔ ”جواب بھی دو، گدھے کہیں کے!“
”انہوں نے ذرا سوچا، پھر بڑی آہستگی سے کہا۔ ”جواب بھی دو گدھے کہیں کے!“
ڈاکٹر صاحب چیخ کر بولے۔ ”شٹ اپ!“
”انہوں نے چنگھاڑ کر کہا۔ ”شٹ اپ!“

ایک صاحب ایک درخت کے نیچے سر جھکائے بیٹھتے تھے۔ چونکہ
بقیہ پاگل شور مچا رہے تھے۔ اس لئے ہم ان کے پاس چلے گئے۔
آداب عرض! ”انہوں نے ہماری طرف دیکھ کر کہا۔
”آداب عرض!“ ہم بولے۔

”بھلا دیکھئے تو سہی۔ کہیں میں پاگل ہوں؟ ان کمبختوں نے زبردستی مجھے
پاگل بنا رکھا ہے۔ مجھے بھی تو پتہ چلے، آخر کیا بات ہے مجھ میں پاگلوں کی سی۔ آپ
مجھ سے سوال پوچھئے۔ میں جواب دوں گا۔“

سوال پوچھئے گئے۔ انہوں نے نہایت صحیح جواب دیئے۔

پھر ہم نے پوچھا۔ ”تمہاری عمر کیا ہے؟“

بولے۔ ”اب تو پتہ نہیں، ویسے میرا ایک چھوٹا بھائی ہے، جو دو سال
گزرے مجھ سے دو سال چھوٹا تھا۔ اب وہ نالائق مجھ جتنا ہو گیا ہوگا اور اگلے
سال مجھ سے ایک سال بڑا ہو جائے گا۔“

میوہی

”تو کیا ان دنوں تم نہیں بڑھ رہے؟“ کسی نے پوچھا۔

”اجی اب میں کیا بڑھوں گا۔ جتنا بڑھنا تھا بڑھ چکا۔“ وہ بولے۔

”آپ یہاں آئے کس طرح؟“ ہم میں سے کوئی بولا۔

”مکیا بتاؤں صاحب! ایک ہی دن میں ہمارے ہاں بے شمار انتقال ہو گئے،

ایک سوتیلی بھتیجی، ایک خلیا ساس، ایک دُور دراز کے رشتے کی نانی جان سب

منقول ہو گئیں۔ 'مُسْتَفْتِے ہیں' اُس روز میں نے کچھ اُلٹی سیدھی حرکتیں کیں، اور یہ

مجھے پکڑ لائے۔ ان باتوں کو کئی سال گزر چکے۔ انھیں بار بار یقین دلانا ہوا کہ میں

پاگل نہیں۔ لیکن کوئی سُنا بھی ہو۔ خدا کے لئے آپ ہی انہیں سمجھائیے۔

ہیں اس غریب پر ترس آ رہا تھا اور پاگل خانے والوں پر غصہ سم نے

اسے یقین دلایا کہ مہتمم صاحب سے مل کر اس کی سفارش کریں گے۔

”کچھ نہ کچھ تو خلل ضرور ہوگا آپ کے دماغ میں۔!“ ایک طرف سے آواز آئی۔

”بالکل نہیں۔ میں اچھا بھلا صحیح الدماغ شخص ہوں۔ البتہ ایک ذرا سا

نقص ہے۔!“

”وہ کیا۔؟“ ہم سب بولے۔

”وہ یہ کہ بعض اوقات میں کچھ کچھ مُرغ بن جاتا ہوں۔“

”مرغ بن جاتا ہوں؟ کیا مطلب؟“

”یہی کہ بیٹھا ہوں۔ اچھی اچھی باتیں کر رہا ہوں۔ پھر ایک دم مُرغ بن جاتا

ہوں۔ اب!۔ اب دیکھئے میں مرغ بن رہا ہوں۔ — ککڑوں — کوں۔

لکڑوں — دون — !

ایک صاحب جو نہایت خوش پوش تھے، بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے، ہم نے سوچا یہ ضرور کم پاگل ہوں گے۔

ہمیں دیکھ کر وہ بڑی بے نیازی سے مکرائے۔

ایک لڑکا بولا "کیوں صاحب آپ پاگل ہیں؟"

وہ بولے۔ "جیسے کہ آپ!"

کوئی بولا۔ "کیا بات کہی یہ۔" خبیثی معلوم ہوتا ہے۔

وہ بولے۔ "جیسے کہ آپ!"

کوئی اور بولا۔ "دیوانہ ہے!"

انہوں نے فوراً جواب دیا۔ "جیسے کہ آپ!"

ایک بولا۔ "بالکل بے وقوف ہے۔!"

"جیسے کہ آپ!"

"یہ تو بالکل ہی گیا گزرا ہے۔!"

وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے بولے۔ "جیسے کہ آپ!"

ایک صاحب چڑ کر بولے۔ "جیسے کہ آپ! جیسے کہ آپ کیا ہوا؟"

جواب ملا۔ "جیسے کہ آپ!"

ایک اور صاحب نے جو نہایت معقول دکھائی دیتے تھے، انہوں نے

صرف ہمارا استقبال کیا بلکہ ایک شعر بھی پڑھا۔ پھر فرمائش کی کہ کوئی اچھا سا شعر انھیں سنایا جائے۔

ایک لڑکے نے یہ شعر پڑھا۔

ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا

کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

کیا تودہ مسکرا رہے تھے اور کیا یکلخت غمگین ہو گئے۔ بولے۔ ”یہ شاعری ہے؟

کیا اسے شاعری کہا جاتا ہے؟ افسوس ہے آپ لوگوں کی ذہنیت پر“ اور

ملک کی حالت پر، جو شاعری غدر کے زمانے میں بھٹی وہی اب تک چلی

آتی ہے، تو بہ تو بہ ہم لوگ بھی کتنے قدامت پسند ہیں، آج کل نئے نئے

مبتغیاء آگئے ہیں، لیکن ہمارے ہاں وہی خنجر، نیچہ اور گٹار استعمال کرتے ہیں

۔ کہیں پیستول کا ذکر ہے نہ راتفل کا۔ ایک سے ایک اچھا سا زرائع ہے۔

ڈاکٹر، کلاریونٹ، گٹار، لیکن ہمارے شعروں سے بانسری اس بُری طرح

چمٹی ہے کہ اُسے پنشن ہی نہیں ملتی۔!“

ہم اس مقل گفتگو پر حیران رہ گئے۔

”تو کیا یہ شعر جو ابھی پڑھا گیا ہے، غلط تھا؟“ کسی نے پوچھا۔

”تعجب ہے کہ آپ لوگ اب بھی اسے شعر ہی سمجھ رہے ہیں، ذرا پھر

پڑھئے۔“

انھوں نے دوبارہ شعر سنایا۔

وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔

”یہی خیال اگر اس طرح ظاہر کیا جاتا تو بہتر تھا۔

دُھندلی دُھندلی شام کے لمحات میں

کام سے فرصت ہو جب

سائیکل لے کر کراتے کی ترے کوچے کا رخ

۔ سائیکل بے لیمپ اور ہر دم کراتے کا خیال

عاشقی کی یہ روایات قدیم

کہ ترے کوچے میں ہر رہگیر سے باتیں کروں

ہر جوان و پیر سے باتیں کروں

اور ٹریفک کے سپاہی کا بھی نکر

جانے کب سیٹی بجا کر آپڑے

اور پوچھے سائیکل کا لیمپ ہے حدت کہاں

آہ یہ مجبوریاں!

غیر کاروں میں پھریں

اور

ہم عشاق کو

سائیکل وہ بھی کراتے کی بے

ہٹے رے ظالم سماج!

یاد آتا ہے ہیں

دُھندلی دُھندلی شام کے لمحات میں
جانا کو چھے میں ترے —

دیکھئے کس قدر بہتر چیز ہو گئی ہے —! ” انھوں نے فاتحانہ انداز سے ہمیں دیکھا۔

” تو پھر شاعری بیکار ہے کیا؟ ” ایک نے پوچھا۔

” اجی بیکار کون مسخرہ کہتا ہے، شاعری تو بڑی کار آمد چیز ہے۔ شاعری کام آنی چاہتے سرمایہ داری کے خلاف، شہر کہو مزدوروں کی حمایت میں، غزلیں لکھو مزدوروں کے رشتہ داروں کے بارے میں، سماج کے متعلق، سماج کے اجارہ داروں کے متعلق، غزلوں کے عنوان ہوں — مزدور کا بہنوی — مزدور کا پھوپھی زاد بھائی، مزدور کی ساس یا پھر سرمایہ داروں کی رعونت پر بھی دو غزلے سہ غزلے لکھے جاسکتے ہیں مثلاً سرمایہ دار کے مٹی ڈھونے سے انکار پر ایک بہت عمدہ غزل کہی جاسکتی ہے، اسی طرح سرمایہ دار کا اپنی لڑکی اور چوکیدار کے عشق پر غصہ ” اور امیری اور غربی میں جو تاجلنا — بھی اچھے موضوع ہیں۔ دیکھئے نایہ سماج ہی کا قصور ہے، آخر سرمایہ دار اپنا سارا رویہ پیسہ میں تقسیم کر کے کاشی یا حج کو کیوں نہیں چلے جاتے، اور یہ لوگ بھی پاگل ہی ہیں، کیوں نہیں کسی دن سارے امیروں کی کوٹھیوں پر ہل چلا دیتے۔؟“

” صاحب! سماج کے متعلق کیا لکھا جائے۔“

شکوہ

”اجی سماج کا بھانڈا پھوڑ دیا جائے، سماج میں کچھ بھی نہیں کرنے دیتا،
ہماری زندگی تلخ کر رکھی ہے۔!“
”غالباً آپ سماج کے غم میں گھل گھل کر یہاں پہنچے ہیں۔!“ کوئی بولا۔
”اجی میں کیا، سماج نے تو بہتوں کو یہاں پہنچایا ہے اور بہت سے یہاں
آئیں گے۔“

”لیکن یہ سماج ہے کیا چیز؟ کوئی خفیہ جماعت ہے یا کوئی خونخوار جتھہ؟“
”آپ کو یہ بھی نہیں پتہ؟ — سماج جو ہے تو وہ — بس سمجھ لیجئے کہ وہ
سماج ہی ہے۔“

ہم سب خاموش ہو گئے۔ وہ پھر بولے۔
”اجازت ہو تو دو چار شعر نئی شاعری کے سناؤں۔“
”ضرور — ضرور!“

”اس میں مصرعوں کے طول و عرض پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔
آج کل کا زمانہ ہے مصروفیت کا، بھلا کس کو فرصت ہے کہ سارا دن ایک شعر
کا وزن تولنے پر ضائع کرے۔ عرض کیا ہے —
”زیر دیوار کھڑے ہیں ترا کیا لیتے ہیں
ہم کوئی چور ہیں —؟“

پھر بولے :
”اگر ہے، سبزہ ہے اور گلزار ہے
کہیں زکام نہ ہو جائے۔!“

رطکوں نے جی کھول کر داد دی ۔

پچھ فرمایا ” جو دیکھی نبض تو بولا یہ ظالم
(بڑے جوش سے) جو دیکھی نبض تو بولا یہ ظالم
بھٹی یہ تو مرے گا۔!“

ہم نے پھر شور مچایا۔

وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ ”چلتے چلتے ایک اور شعر سن لو۔
عص کیا ہے۔“

کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
(ترنم سے) کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
کہیں وہ کچھ چڑا نہ لیں۔!“

اس طرح ہم کئی دفعہ وہاں گئے، طرح طرح کے تماشے دیکھے۔ دل کھول
کر بنے، میں خوش تھا کہ یہ سب پُر لطف واقعات سرینگر پہنچ کر سب کو
سناؤں گا۔ انہیں بھی تو پتہ چلے کہ میں نے یوں ہی وقت ضائع نہیں کیا تھا۔

علی الصبح لاری میں بیٹھا، نہ جانے پاگلوں کو دیکھ دیکھ کر کیا دہم ہو گیا
تھا۔ ہر ایک کو گھور گھور کر دیکھتا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ کالی عینک لگا رکھی
تھی ورنہ ضرور کسی نہ کسی سے جھڑپ ہو جاتی۔

لاری ایک شہر میں رُکی۔ ایک بزرگ نے سر باہر نکالا، اُدھر ایک

آپ میرا مطلب سمجھتے ہیں نا۔ یعنی ٹیچک کا۔!“
 ”چیچک کا ٹیکا!“ شیخ صاحب چُپکے سے بولے۔

”جی ہاں، بس دہی! میر صاحب کی جان میں جان آئی۔“ جی تو وہ
 لوگوں نے نہیں کرایا۔“

اس کے بعد کئی مرتبہ چیچک کے ٹیکے کا ذکر ہوا، لیکن میر صاحب
 کچھ ایسے سہم گئے کہ انہوں نے عمداً اس خوفناک لفظ سے پرہیز کیا۔

ایک صاحب اپنے سامنے چھوٹا سا نقشہ کھولے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا
 کہ لاہور میں مکان بنائیں گے اور اپنے بھائی صاحب سے مشورہ لینے جموں
 جا رہے ہیں۔ وہ ایک ڈبلی پتلی سی نوٹ بک بار بار پڑھتے اور پھر نقشہ
 دیکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ میں نے ذرا جھجک کر دیکھا۔ عجب فضول سا
 نقشہ تھا۔ ایک پیلے کاغذ پر بے ڈھنگے خطوط تھے۔ ایک کونے میں کچھ
 نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ کچھ لائیں پنسل کی تھیں اور کچھ رنگین روشنائی
 کی۔ کاغذ پر چکنائی اور ہلدی کے دھبے بھی تھے۔ شاید شور باگر چکا تھا۔
 وہ لگاتار اسی نقشہ کی تبادلت میں مصروف رہے۔

جموں میں ان کے بھائی منتظر ملے، چونکہ ان کا نوکر ابھی نہیں آیا تھا۔ اس
 لئے لاری کے پاس کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔

نوراً ہی مکان کا قضیہ شروع ہو گیا۔

ان کے بھائی بولے۔ ”ہاں ہاں! جیسی چیز سے میں تمہارے خط“

شکوہ

پڑھے کیا ہیں سونگھے ہیں۔ تمہارا لکھا تو کوئی کوئی پڑھ سکتا ہے۔ خاک سمجھ میں نہیں آیا کہ تم نے کونسی جگہ پھنی ہے؟

”تو پھر نوٹ بک سے پڑھ کر سنا دوں؟“

اُن کے بھائی نے سر ہلا دیا۔

اُنہوں نے نوٹ بک نکالی اور پڑھنا شروع کر دیا۔ ”حلوائیوں کے محلے سے جو سڑک نائیوں کے کوچے کی طرف جاتی ہے، اس کے چوک سے بائیں طرف مڑ کر قطب الدین کبارڈیے کی دکان سے جو سڑک نکلتی ہے، اس کے چوک سے بائیں طرف مڑ کر ایچاد علی پنساری کی دکان کی طرف چلنا شروع کر دیں اور اس کے چوک سے بائیں طرف مڑ کر — معاف کیجئے آپ قطب الدین کبارڈیے کو تو جانتے ہیں نا؟“

”ہاں جانتا ہوں۔“

”افہ یاد آیا، اسی کے ہاں سے تو آپ پُرانے پرچے خریدا کرتے تھے۔“

جی ہاں تو پھر اس چوک سے بائیں طرف مڑ کر۔“

”کون سے چوک سے؟“

”اجی اسی چوک سے جو کہ ہے قطب الدین کبارڈیے کی دکان کی بائیں

طرف مڑ کر، جو کہ ہے ایچاد علی پنساری کی دکان سے بائیں طرف مڑ کر جو

کہ ہے۔“

”میں سمجھ گیا۔ تو آخر وہ جگہ ہے کہاں؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔ تو وہاں سے ایک پتلی سی گلی نکلتی ہے جو ہوگی کوئی

ڈیڑھ سو گز لمبی اور سوا گز چوڑی — اس میں آپ چلتے جائیے۔ آخر ایک ایسی جگہ آئے گی جہاں گلی بند ہو جائے گی اور آگے کوئی راستہ نہ نکلے گا، فوراً بائیں ہاتھ کی حویلی میں بغیر دروازہ کھٹکھٹاتے داخل ہو جائیے۔ دراصل وہ دروازہ ہی دروازہ ہے۔ وہاں حویلی دوہلی کچھ نہیں ہے۔ وہاں سے آپ کو ایک راستہ ملے گا جو ایک نالے کے ساتھ ساتھ چلے گا — پھر اندر —!“

”باقی زبانی بتا دو۔!“

”اچھا!“ انہوں نے نوٹ بک بند کر لی۔ ”تو عین اُس نالے پر وہ جگہ ہے۔ پڑوس میں ایک گلاب کا باغیچہ بھی ہے۔ آخر کچھ نہ کچھ خوشبو تو وہاں سے ضرور آیا کرے گی۔“

”پچ پچ — پچ —!“ اُن کے بھائی صاحب بولے۔ ”سچ پوچھو تو مجھے یہ جگہ پسند نہیں، اول تو وہاں پیٹینا مشکل ہے اور اگر پہنچ گئے تو نکلنا مشکل ہے اور کوئی جگہ نہیں کیا؟“

”اجی ہے تو، مگر وہ قوالوں کے محلے میں ہے۔ چوبیس کھنٹے وہ چیم دھا رہتی ہے کہ بس خدا کی پناہ!“

”آہا ہا ہا!“ اُن کے بھائی خوشی سے چہک کر بولے۔ ”کیا بات ہے! قوالوں کا محلہ ہے سچ مچ! بڑا لطف رہے گا۔ کہاں ہے وہ جگہ؟“

”آپ موچی دروازے سے چلتے، ذرا سی دُور جا کر دائیں طرف مڑ جائیے، پھر ذرا دُور جا کر دائیں طرف وہاں سے ایک چوڑی سی گلی میں چلے جائیے۔ پھر کافی دُور جا کر دائیں طرف مڑ جائیے — پھر بائیں طرف —!“

”میرا خیال ہے کہ میں وہاں کبھی گیا ہوں۔“ اُن کے بھائی بولے۔
 ”آپ نہ بھی گئے ہوں، مگر آپ کے عزیز دوست قلندر حسین تو وہیں
 رہتے ہیں۔ اور اُن کے وہ دوست حضرت ہوش ہوشیار پوری اور
 لالہ امرت امرتسری بھی وہیں رہتے ہیں۔“

”قلندر حسین وہاں رہتے ہیں؟ ایمان کی قسم؟“ وہ چیخ کر بولے۔
 ”اجی یہ قلندر حسین خوب آدمی ہیں۔ اُس دن میں ایک صاحب کے
 ساتھ وہاں گیا۔ وہاں بہاں اُن کے وہ جو دوست رہتے ہیں۔ جن کی داڑھی
 یوں ہے۔ (ہاتھ سے بنا کر) جب میں وہاں پہنچا تو یہ جاچکے تھے۔ اپنے
 اُن دوست کے ہاں، جن کی مونچھیں یوں ہیں، یہ وہاں نہیں ملے، خیر! تو
 ہم دوسرے روز پھر وہیں گئے، وہ پھر نہیں ملے۔ اس دفعہ ان کے گھر سے
 کوئی نکلا اور بولا کہ آپ کے آنے سے ذرا دیر پہلے وہ وہاں چلے جاتے ہیں
 اب ہم وہاں جانے لگے (ہاتھ سے ایک سمت اشارہ کر کے) وہاں —
 جہاں وہ جایا کرتے تھے۔ وہاں جا کر ہمیشہ پتہ چلتا کہ وہ تو (دوسری سمت،
 چلے جاتے ہیں۔ خیر! اُس روز ہم اُن کے ساتھ وہاں بھی گئے۔ وہاں معلوم ہوا
 کہ وہاں وہ تھے ہی نہیں۔!“

”خوب خوب! تو گویا وہ وہاں کبھی نہیں گئے؟“
 ”اجی وہاں تو گئے تھے لیکن (زور لگا کر) وہاں کبھی نہیں گئے، جہاں
 ہمیں لوگوں نے تب بنایا تھا۔ جب ہم وہاں گئے تھے۔“
 ”لاحول ولا۔۔ تو تم (اشارہ کر کے) وہاں کیوں نہیں گئے جہاں وہ اس

دفعہ گئے تھے :-

”اچھی یہی تو رو رہا ہوں کہ وہ وہاں بے ہی نہیں، جہاں ہم اس مرتبہ گئے
در اصل وہ جاتے ضرور تھے۔ وہاں بھی۔ اور وہاں بھی — لیکن (زور لگا کر)
وہاں کبھی کبھار جاتے تھے۔!“

”تو پھر وہ کبھی بے بھی آپ کو؟“ ایک بیزار سے شخص نے پوچھا جو اس
گفتگو کو بڑے انہماک سے سُن رہا تھا۔

دونوں بھائی ناراض ہو گئے اور بڑی قہر بھری نگاہوں سے اس بد نصیب
انسان کو دیکھا۔ اُن کا نوکر بھی آگیا تھا جو سامان اُٹھا رہا تھا۔

”اچھا تو اب گھر چلیں۔“

”جی ہاں چلئے۔“ اُنہوں نے کہا۔ ”تو میں کہہ رہا تھا کہ قلندر حسین صاحب
پھر کہیں اور جانے لگے، لیکن نہ تو وہاں (اشارہ کر کے) اور نہ (زور لگا کر)
وہاں — بلکہ (ایک اور طرف اشارہ کر کے) وہاں — جہاں وہ کبھی نہ
گئے تھے — اور پھر۔!“

اُن کی آواز دھیمی ہوتی گئی۔ وہ کافی دُور جا چکے تھے۔ اُن کی گفتگو سُنائی
نہیں دے رہی تھی۔ البتہ ہاتھوں کا مٹکانا اور سروں کا گھمانا اس بات کا شاہد
تھا کہ ابھی تک قلندر حسین صاحب مدظلہ ہی کے متعلق بحث ہو رہی ہے
کہ وہ کہاں تشریف لے جایا کرتے تھے — وہاں — یا (زور لگا کر) وہاں۔

ساتھ کی

ساتھ کی سیٹ پر دُبلے پتلے کھدر پوش اپنے سامنے بیٹھے ہوئے

شکوے

لبے تڑنگے شکاری سے کہہ رہے تھے۔ "میں انقلاب چاہتا ہوں۔ ایک ایسا انقلاب جسے میں نے خوابوں میں دیکھا ہے، جس کی تمنا میرے دل میں چلتی رہی ہے، میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش۔ ایک انقلاب!" شکاری صاحب بولے۔ "کس قسم کا؟ اور کس نمبر کا؟" غالباً وہ سمجھے کہ کسی کارٹوس کا ذکر ہو رہا ہے۔

سامنے کے مولانا بولے۔ "لاحول ولا قوۃ!" کھدر پوش صاحب نے اپنی آنکھیں گھمائیں اور انگلی پنچا کر بولے "جب وہ انقلاب آئے گا، تو ہم سماج کی تکتا بولی کر دیں گے، آہ! اس ظالم دہشتناک درندے نے ہماری نسلوں کو تباہ کر ڈالا ہے۔" شکاری صاحب بولے۔ "کون سے جنگل کی بات ہے؟"

مولانا بولے "اجی لاحول ولا، آپ تو شکاری معلوم ہوتے ہیں۔" کھدر پوش بولے۔ "ہم میں سپاہی بننے کی صلاحیت اب تک موجود ہے ہم تلواروں سے کھیل سکتے ہیں، سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ہماری رگوں میں جنگجو قومن کا ہمزور مار رہا ہے، اور۔ اور۔ (شکاری سے) صاحب! آپ کے پاس پنسل تراش ہو گا کیا؟۔ یہ پنسل ٹوٹ گئی ہے ذرا۔!"

شکاری صاحب نے پہلے تو اپنے تیس چالیس جیبوں والے کوٹ کو جھنجھوڑا پھر کسی جیب سے ایک ڈیڑھ ہاتھ لمبا چاقو نکالا، اور کھول کر صاف کرنے لگے۔ کھدر پوش کی جیسے روح قفسِ عنبری سے پرواز کر گئی۔ سہم کر بولے "اجی اسے دبیں رہنے دینے، خطرناک ہتھیاروں سے یوں نہیں کھیلا کرتے"

یقیناً مجھے پنسل کی کوئی ضرورت نہیں، خدا کے لیے اسے بند کر لیجئے۔ میرے پاس پارکر کا قلم موجود ہے۔ شکریہ۔“

مولانا ہنستے ہوئے بولے۔ ”لا حول ولا قوۃ، آپ ضرور شکاری ہیں“
 ”جی ہاں، میں ٹھکاری ہوں، آپ کو کوئی اعتراض ہے؟“
 ”جی نہیں، بھلا مجھے، لا حول ولا کیا اعتراض ہو سکتا ہے، یہ بھی خوب رہی، لا حول ولا۔ آپ اکیلے ہی ہیں کیا؟“

”جی ہاں، اکیلا ہوں، بندوقیں اور کتے پہلے پہنچ چکے ہیں، تین لاجواب بندوقیں ہیں اور گیارہ کتے، جن میں سے چار تو خاصے بڑے ہیں، اتنے اتنے جتنا آپ کا یہ لڑکا ہے۔ اور باقی یہی کوئی تیس چالیس سیر کے ہیں۔“
 اس مرتبہ مولانا باقرآت بولے۔ ”لا حول ولا قوۃ۔ اِلا۔ بلا۔“
 ”کیوں صاحب! آپ ہم سے بدظن ہیں کیا؟“ شکاری نے پوچھا۔
 ”لا حول۔ کون کافر بدظن ہے؟“

”تو آپ ہمیں یہاں سے بھگانا چاہتے ہیں؟ یا آپ کو ہم پر شبہ ہے؟“
 ”میں سمجھا نہیں، لا حول ولا۔!“

”یہ کیا آپ بار بار لا حول پڑھ رہے ہیں؟“
 ”لا حول ولا قوۃ۔ (وہ شرمائے گئے)۔ کوئی جان بُجھ کر مختور ہی کہتا ہوں۔ یونہی منہ سے نکل جاتا ہے۔ بس لا حول۔“ (بڑے ضبط سے انھوں نے بقیہ حصہ روکا) پھر وہ یک لخت چُپ ہو گئے۔

ایک جگہ وہ اُترنے لگے، لاری مٹھرتے ہی کچھ دیر ادھر ادھر جھانکنے

تنگوٹے

رہے۔ پھر یکایک چمخ کر بولے۔ "اماں عبدالقدوس صاحب — لاحول ولا قوۃ۔"

جن صاحب کو مخاطب کیا گیا تھا۔ انھوں نے بھی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"ارے لاحول ولا قوۃ کہاں ہو بھئی؟"

"لاحول — ادھر دیکھو بھی، اماں عبدالقدوس صاحب لاحول ولا قوۃ۔ ان کا سامان اُتار دیا گیا اور لاری چلتے لگی۔ شکاری نے اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے حضرات کے کان میں کچھ کہا اور پھر بلند آواز سے بولے۔

"نعرۂ لاحول!"

وہ سب چلا کر بولے۔ "لاحول ولا قوۃ — الّا — باللہ"

مولانا کھسیانے ہو گئے۔ اُن کے ہونٹ پلے، انھوں نے کچھ کہا۔ ہم سُن تو نہ سکے۔ غالباً لاحول ہی پڑھی ہوگی۔

لاری میں رونق کم ہو گئی۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پیچھے کی سیٹ پر ایک جوڑا بیٹھا تھا۔ ایک حسین لڑکی اور ایک بدتمیز سالڑکا۔ بدتمیزیوں کہ اس کی حرکات بالکل فضول سی تھیں۔ دونوں نئے نئے شادی شدہ معلوم ہوتے تھے لڑکی کہہ رہی تھی۔ "ذرا نیچے دیکھئے تو سہی، نالے کا پانی کس طرح جھاگ اُڑا رہا ہے۔ پتھروں سے سر دے دے کر مارتا ہے، جیسے کسی کا ماتم کر رہا ہو، بھلا اسے کیا غم ہے؟"

لڑکا چونک پڑا۔ وہ شاید اونگھ رہا تھا، پہلے دو تین چھینکیں ماریں، پھر بولا — ”کیا کہا تم نے؟“

”ذرا نالے کا پانی تو دیکھئے کتنا اچھا لگ رہا ہے؟“

”اچھا لگتا ہوگا تمہیں۔ مارے شور کے میرے تو کان پھٹے جا رہے ہیں۔“
لاری چڑھائی پر جا رہی تھی — ”وہ دیکھئے اس ننھی سی سڑک سے ہم آئے تھے۔ وہ پہاڑیوں نظر آرہے ہیں، جیسے ریت کی جھوٹی چھوٹی لہریں ہوں، ہم نہ جانے کتنی بلندی پر ہیں۔“

لڑکے نے دو تین اور چھینکیں ماریں اور بولا۔ اور جو یہاں سے گر پڑیں تو بڑی پسلی ایک ہو جائے۔“

لڑکی چپ ہو گئی۔ دیر تک ان میں سے کوئی نہ بولا۔ سورج مغرب ہو رہا تھا۔ آسمان پر رنگ برنگے بادلوں کے عجیب نمونے بنے ہوئے تھے۔ دفعۃً لڑکی مسرت سے مغلوب ہو کر بولی۔ ”وہ دیکھئے کیسے رنگ رنگ کے بادل ہیں اور وہ درختوں کی قطار اونچے پہاڑوں پر یوں لگتی ہے جیسے سنہری سبجاف ہو اور یہ ننھے ننھے پرندے اُڑتے ہوئے۔!“

”سُن لیا! — سُن لیا، تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ روز سورج نکلتا ہے اور ڈوبتا ہے۔ کسی نے سورج ڈوبتا نہ دیکھا ہو تو کوئی بات بھی ہے، اُونہہ! شفق کی بہار۔ بادلوں کی سبجاف۔ خاک۔ دھول۔!“

پھر اپنی ناک سے کھیلنے لگا، شاید اُسے زکام تھا۔

لڑکی کچھ دیر چپ رہی، کدّر آنے والا تھا۔ لاری ایک جگہ مڑی اور

چاند سامنے آگیا۔ جوابی ابھی نکلا تھا۔ لڑکی رہ نہ سکی۔ ”کتنا چمک دار چاند ہے، ایسا چاند کبھی شہروں میں بھی دیکھا؟ یوں لگتا ہے جیسے۔ جیسے۔“
”کیا مصیبت ہے؟“ تنگ کر دیا تم نے، جی چاہتا ہے لاری سے
چھلانگ لگا دوں، آخر کیا دھرا ہے اس چاند میں؟“

لڑکی منہ بسور کر بولی۔ ”تو آپ کو قدرتی نظارے اچھے نہیں لگتے؟“
”کوئی خاص نظارہ ہو تو پسند بھی کروں، مگر تمہارے لیے تو ہر چیز
قدرتی نظارہ ہے۔ گائے چر رہی ہو۔ کتا بھونک رہا ہو۔ بکری جگالی کر رہی
ہو، کچھ بھی ہو رہا ہو۔“

”لیکن شادی سے پہلے تو آپ ہمیشہ میری باتوں کو پسند کیا کرتے تھے،
اور دکالت پڑھتے ہوئے بھی آرٹ کو پسند کرتے تھے۔“

”تب اور بات تھی۔ اب تو شادی ہو گئی ہے اور وکیل بھی بن چکا ہوں۔“

رات بھر کدّر میں قیام رہا۔ میرے دماغ میں عجیب عجیب خیالات
آ رہے تھے۔ لاری کے مسافر کچھ پاگل سے دکھائی دیتے تھے۔ جس کسی کی
حرکات و سکنات کو غور سے دیکھنے لگو۔ اس کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگتا
تھا لیکن وہ پُر جلال چہرے والے مولانا تو ضرور عقلمند ہوں گے، کچھ بھی ہو وہ
کبھی ایسی باتیں نہیں کر سکتے اور وہ سردار صاحب بھی ذی ہوش۔ معلوم
ہوتے ہیں۔

صبح صبح سفر شروع ہوا۔ راستے میں جا بجا بید مجنوں کے درخت

یونہی

کھڑے تھے۔ ایک صاحب جو بڑے غور سے ہر ایک درخت کو دیکھ رہے تھے۔ بلکہ شاید گن رہے تھے پلٹ کر بولے۔ ”کیوں صاحب! یہ درخت کون سا ہے؟“

”بید مجنوں!“ میں نے کہا۔

”بے۔۔ دے۔۔ مج۔۔ نوں۔۔!“ انھوں نے الفاظ کو چباتے ہوئے

فرمایا۔ ”کہا، طلب ہوا اس کا؟ یعنی مجنوں کی چھڑی؟“

ساتھ والے حضرت ہنس کر بولے۔ ”جی نہیں یونہی نام ہے۔ اس درخت

کی ٹہنیاں یوں جھکی رہتی ہیں۔ جیسے مجنوں کے بال پریشان رہا کرتے تھے۔“

براہر والے پنڈت جی بولے۔ ”غلط ہے صاحب! اس درخت کو دور

سے دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی رورہا ہو۔“

اب خاں صاحب کہاں رہ سکتے تھے، بولے۔ ”جناب، یہ بات نہیں،

بلکہ مجنوں اس درخت کو پکڑ کر رویا کرتا تھا۔“

جناب وہی صاحب جو نام پوچھ رہے تھے، کچھ دیر سوچ کر بڑی سنجیدگی

سے بولے۔ ”تو جناب! مجنوں کشمیر میں گزرا ہے کیا؟“

سب کے سب ہنس دیتے۔ خاص طور پر میرے داہنے ہاتھ نیٹھے

ہوئے سردار صاحب تو بڑے زور سے ہنسنے اور کافی دیر تک ہنسنے رہے،

جب لاری میں سکون ہو گیا تو چپکے سے میرے کان میں بولے۔ ”بات کیا تھی؟“

اب ہمارا سفر ختم ہو رہا تھا۔ سری نگر نظر آنے لگا۔ مولانا کا چھوٹا سا

بچہ خوش ہو کر بولا۔

”ابا جان ! وہ دیکھئے سری نگر آگیا۔“

مولانا پر مرگی کی قسم کا دورہ پڑا۔ اُنھوں نے اپنے ہونٹ چبا ڈالے ،
آنکھیں بند کر لیں۔ ڈیڑھ ڈیڑھ بالشت کی مونچھیں ایک بالشت اور اوپر
چڑھ گئیں ، کچھ دیر تو اسی طرح مراقبہ میں رہے۔ پھر چیخ کر بولے۔ ”نامقول
بچے ! یہ تو نے کیا کیا ، سب کئے کر اٹے پر پانی پھیر دیا۔ تو ہمارے خاندان کا
نام ڈبو کر چھوڑے گا۔ وارنٹی سفید ہوگئی (بالکل سیاہ تھی) تجھے پڑھاتے
پڑھاتے۔ کس قدر غلط اُردو بولتا ہے تو — (منہ چڑا کر) — سری نگر آگیا
بد نصیب بچے ! سری نگر کوئی آدمی ہے ، پرندہ ہے یا چوپایہ ؟ یا اس کے نیچے
پہتے لگے ہیں جو آگیا۔ اس کی جگہ چھوٹے منہ سے یہ کیوں نہ نکلا کہ ہم سری نگر
پہنچ گئے۔ کیونکہ جو چیز متحرک ہے وہ تو ہم ہیں اور ساکن ہے سری نگر۔ پس
متحرک چیز ساکن کی طرف جا رہی ہے نہ کہ ساکن متحرک کی طرف۔“

چار پانچ سال کا بیچارہ سچے ڈر گیا۔ اُس کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ غیب
نے سوچا شاید دیکھنے میں غلطی ہوگئی ہے۔ پھر کھڑکی سے جھانکنے لگا اور ہم
کر بولا۔ ”ابا جان ! سری نگر ہی تو آ رہا ہے۔“

مولانا نے ایک لمبا سانس لیا اور بھیچڑوں کا پورا زور لگا کر چلائے۔
”بس بس خاموش اونا ہنسا بچے ! غلطی پر غلطی کئے جا رہا ہے۔ ایک
لفظ اور نکالا تو گلا گھونٹ دوں گا۔“

اور میں سوچنے لگا۔ کیا ہم سب پاگل ہیں ؟ اگر ممکتل طور پر نہیں تو
تھوڑے بہت ہی۔ جن لوگوں کو ہم سرسری نظر سے دیکھتے ہوئے گزر جاتے

ہیں۔ اگر ان کی ایک ایک حرکت کا بغور مطالعہ کریں تو کیا ہو؟

جن باتوں پر ہم یونہی مہنس دیتے ہیں، یا جن پر دیدہ و دانستہ توجہ نہیں کرتے ذرا انہیں اچھی طرح سے سوچیں تو کیسے مضحکہ خیز نتائج نکلیں؟ مجھے پاگلوں کے لطیفے بھولتے جا رہے تھے، کیونکہ ان سے کہیں عجیب و غریب تماشے میں عقلمندوں میں بیٹھ کر دیکھ چکا تھا۔

سری نگر میں جب سب نے پاگلوں کے متعلق پوچھا، تو نہ جانے کیوں مجھ سے وہ پُر لطف کہانیاں نہ سُنائی گئیں۔
میں یونہی ٹال مٹول کر گیا۔

مشورے

(ریڈیو کا ایک فیچر)

اماؤنسر۔ "خواتین و حضرات! اس مہینے میں طرح طرح کے مشورے موصول ہوئے۔ پہلے تو ہم سوچتے رہے لیکن چونکہ جدت کو ہر جگہ پسند کیا جاتا ہے اس لئے انہیں پیش کرتے وقت ہمیں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہے۔ خود ہی سوچتے جہاں ایک کرکٹ کا میچ نشر ہو سکتا ہے اور مشاعرے نشر کئے جاسکتے ہیں وہاں ایک لڑائی کیوں نہیں پیش کی جاسکتی؟ یا ایک قدرتی نظارے کو کیوں نہیں بیان کیا جاسکتا؟

جن صاحب نے ہمیں یہ مشورے بھیجے ہیں۔ ہم ان کے احسان مند ہیں۔ انہوں نے ہماری توجہ روزمرہ کی روٹین ROUTINE چیزوں سے ہٹا کر ایک ترقی پسند راستے کی جانب مبذول کرائی ہے اور ترقی پسند باتوں پر تو لوگ جان چھڑکتے ہیں۔

آج ہم اس فیچر میں تین مشورے پیش کر رہے ہیں، جو یکے بعد دیگرے نشر کئے جائیں گے۔ بقیہ مشورے ہمارے پاس محفوظ ہیں۔

۱۔ جنگ

سب سے پہلے ہم ایک سچ پنج کی جنگ نشر کرتے ہیں۔
یہ جنگ مغلوں اور مرہٹوں کے درمیان ہوئی ہوگی۔ کہاں؟ مغربی گھاٹ
کے کسی ناہوار میدان میں، یا شاید مشرقی گھاٹ کے آس پاس۔ ہم وثوق سے
نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ہمیں ڈر ہے کہ یہ کہیں وسطی سطح مرتفع پر ہی نہ ہو۔
دونوں فوجیں لڑائی پر کیوں آمادہ ہیں؟ — اس کی وجہ "بابر میموریل
شیلڈ" بتائی جاتی ہے۔

سامعین! اس سے پہلے اس شیلڈ کے لیے مرہٹوں نے لاکھ کوشش کی،
اچھی سے اچھی ٹیم بھیجی — ہمارا مطلب فوج سے ہے۔ لیکن ہمیشہ مغل ہی جیتے
رہے کیونکہ ان کی صحت کہیں اچھی تھی۔ اس مرتبہ دیکھئے کیا ہوتا ہے؟ ہم چند
انگریزی الفاظ استعمال کریں گے۔ آپ چنداں خیال نہ فرمائیں۔ یہ ہم مجبور
ہو کر کر رہے ہیں۔ ہاں تو اس سالانہ ٹورنامنٹ کی چوتھی جنگ پیش کی
جا رہی ہے۔

اس وقت ساڑھے نو بجے ہیں۔ ہم ایک چھوٹی سی پہاڑی پر کھڑے
ہیں۔ سامنے ایک وسیع میدان ہے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے سب کو
سکیاں آ رہی ہیں۔ سورج ابھی ابھی نکلا ہے۔ امید ہے دوپہر کو خاصی گرمی
ہو جائے گی۔ میدان کی گھاس چند روز ہوئے کافی ٹکٹی تھی۔ میدان پر اداس
بہت پڑی ہوئی ہے۔ کہیں لوگوں کے اور گھوڑوں کے پاؤں نہ پھسلنے لگیں۔

سفید لائیں لگائی جا رہی ہیں۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑے نیچے کے نیچے بے شمار سپاہی کھڑے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ لاکھوں ہوں گے، لاکھوں نہیں تو ہزاروں ضرور ہوں گے۔ مغل اور مرہٹے آپس میں باتیں کر رہے ہیں، شروع شروع میں یہ لوگ لڑائی سے پہلے کبھی نہ ملتے تھے۔ لیکن اب سپورٹس مین بن گئے ہیں۔ ایک دوسرے سے سفر کے حالات پوچھ رہے ہیں۔ کچھ فوجہ جنگ کی مشق کر رہے ہیں اور چند سپاہی بچے لڑا رہے ہیں۔ پورے دس بجے لڑائی شروع ہو گئی۔ صرف بیس منٹ رہ گئے ہیں۔

پہلے لڑائی کے فیصلے کے متعلق بڑی گڑبڑ ہوتی تھی، بعض اوقات تو فیصلہ بالکل نہیں ہو سکتا تھا کہ کون جیتا ہے۔ مرہٹے کہتے تھے ہم جیتے ہیں اور مغل کہتے تھے ہم۔ چنانچہ اس سال دو امپائر آئے ہیں، ایک امپائر بنگال سے بلایا گیا ہے اور دوسرا بلوچستان سے۔ ان دونوں کو اس لڑائی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اس لئے ہمیں اُمید ہے کہ فیصلہ غیر جانب دارانہ ہوگا اور بلا حیل و حجت قبول کیا جائے گا۔

سامعین! پچھلے جنگ ختم ہوئی اور جب فیصلہ سنایا گیا تو اس قدر ناپسند کیا گیا کہ لڑائی دوبارہ شروع ہو گئی اور ہفتوں تک ہوتی رہی، یہاں تک کہ دونوں ٹیموں کا مجھ کس نکل گیا۔

وہ دیکھئے! دونوں امپائر گھوڑوں پر سوار، سفید زرہ بکتر پہنے میدان میں آ رہے ہیں۔ ان کے گھوڑے بڑے تندرست ہیں اور سفید رنگ کے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ایک لمبا سا بگل ہے۔ جسے وہ فائل ہونے پر یا

لڑائی روکنے کے لئے بجائیں گے۔

وہ اُنھوں نے اشارہ کیا۔ اب دونوں فوجوں کے کپتان میدان میں آئے ہیں۔ مغل کپتان جس کا نام مرزا بعلبک بیگ ہے۔ ایک لمبا تڑنگا پلا ہوا کھلاڑی ہے، جسے دیکھ کر آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوتا ہے۔ ادھر مرہٹوں کا کپتان بالاجی باجی کھڑ بڑ دیو مقابلہ پستہ قد ہے۔ اس کا رنگ کچھ سیاہی مائل ہے، صحت واجبی ہے، مگر مسنتے ہیں کہ چستی اور چالاکی میں کسی سے کم نہیں۔

وہ اُنھوں نے ڈھال ہوا میں اُچھالی اور ٹاس کیا۔ ڈھال سیدھی گری مرہٹے ٹاس جیت گئے۔ اُن کا کپتان ناچتا کودتا واپس جا رہا ہے۔ اب مرہٹوں کی ساری فوج بائیں طرف اکٹھی ہو رہی ہے۔ مغل دہنی طرف ہیں۔ مغلوں کے سامنے سورج ہے، جس سے اُن کی آنکھیں لازمی طور پر چنڈھیا جائیں گی۔ لیکن وہ ٹاس جو مار چکے ہیں۔

ارے! یہ کیا؟ — ہاں! — امپائرول نے دونوں کپتانوں کو پھر بلایا ہے۔ انھیں سمجھا رہے ہیں کہ کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے جس سے ناک کٹ جائے یا کان اڑ جائے۔ لڑتے وقت ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھنا، آدمیت سے لڑنا، کیونکہ آدمیت ہی اصلی چیز ہے۔ سامعین میں ایک شعر یاد آگیا۔ ہمیں ایسے موقعوں پر اکثر شعر یاد آ جاتے ہیں۔ عرض ہے

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ!

ست جہت یہ نہ ہوئے، پست قامت ہو تو ہو

اب دونوں کپتان واپس اپنی اپنی فوجوں میں جا رہے ہیں اور ٹیموں کو ترتیب دے رہے ہیں۔ مغل کپتان نے اپنی ساری فوج اگلی صفوں میں ٹھونس دی ہے۔ فل بیک دُستہ بالکل معمولی سا ہے اور گول کیپر دُستہ تو سرے سے غائب ہے۔ پیچھے کوئی سپاہی نظر نہیں آتا۔ عجب تماشا ہے، مرہٹے بالکل برعکس کر رہے ہیں، اپنا اپنا طریقہ ہے صاحب !
(چرب کی آواز)

وہ لیجئے، ڈھول بج رہے ہیں۔ بگل بجایا گیا۔ ایک دو تین ! —
لڑائی شروع ہو گئی !

اس وقت ہماری حالت بھی قابلِ دید ہے، ہمارا دل بُری طرح دھڑک رہا ہے۔ آہا ہا ہا ! مُغلوں کا سنٹر فارورڈ دُستہ تیر کی طرح جا رہا ہے۔ مرہٹوں کے ہاف بیک دُستے نے اُسے جانے دیا۔ ادھر ادھر ہو گئے۔ سامعین ! اس میں ضرور کوئی چال ہے، وہ فل بیک دُستے تک پہنچ گئے ہیں، ارے ! یہ کیا؟ وہی ہوا۔ جس کا ہمیں ڈر تھا۔ فل بیک دُستہ بجلی کی طرح تڑپا۔ ہاف بیک دُستہ واپس پلٹا اور مغل دُستہ وہیں دھر لیا گیا۔

امپائر گھبراٹے ہوئے ادھر ادھر پھر رہے ہیں، کیوں نہ ہو؟ آج کی جنگ کی لاج اُن کے ہاتھ ہے۔ وہ دیکھتے دو سپاہی باہر نکالے جا رہے ہیں، کیا بات ہے؟ مٹھریٹے ہم دریافت کر کے بتاتے ہیں۔

(ایک وقفہ)

بات یہ تھی کہ ایک مغل سپاہی نے ایک مرہٹے کو دھکا مار کر گھوڑے

سے گرا دیا تھا۔ مرہٹے نے مغل کی ٹانگ میں کاٹ کھایا۔ مغل حقارت سے بولا۔
 ”اُف، اب علاج کے لیے ناحق کسولی جانا پڑے گا۔“

آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ کسولی میں باؤلے کتے کے کاٹے کا علاج
 ہوتا ہے۔ اس سے مرہٹے کے لطیف جذبات کو ٹھیس لگی۔ وہ بولا۔ ”بھڑ تو ہسی“
 ابھی کہتا ہوں امپائر سے: ”چنانچہ دونوں کو باہر نکال دیا گیا۔“

اچھا ہوا، جب تک ایسی سزائیں نہ دی جائیں لڑائی میں گڑبڑ پیدا ہونے
 کا اندیشہ ہے۔ افوہ! دوسرے مغل دستے کا بھی وہی حشر ہوا، آخر مغل کوئی اور
 طریقہ کیوں نہیں استعمال کرتے، مرہٹے چپ چاپ اپنی اپنی پوزیشن پر
 جے کھڑے رہتے ہیں۔ مغل تیزی سے آتے ہیں۔ یہ کوئی مدافعت پیش نہیں کرتے
 جب اُن کا دستہ گول کیپر دستے تک پہنچتا ہے تو سب مرہٹے ٹوٹ پڑتے ہیں
 اور انہیں دبوچ لیتے ہیں۔ اس قسم کے کھیل سے تو کبڈی ہی اچھی۔ واہ واہ
 — یوں کب ہوتا ہے آخر؟ اب وہاں کا اثر بھی کوئی چیز ہے، غذا اور صفحہ
 بھی کوئی معنی رکھتی ہے۔ اتنی سی دیر میں مرہٹے تھک گئے۔ بُری طرح مانپ
 رہے ہیں، کئی حضرات اپنے خود اور زرہ بکتر اتار اتار کر امپائروں کو دے
 رہے ہیں۔

وہ امپائروں نے نیچے کی طرف چلا کر کہا۔ ”ذرا پانی بھجوانا“ چنانچہ چند
 سقے پانی پلانے جارہے ہیں۔

اب مغلوں کا پلہ بھاری ہے، مرہٹوں کی خوب خاطر تواضع ہو رہی ہے،
 مغل انہیں پچھاڑے ڈالتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹے ورزش نہیں کرتے

شکر نے

اگر یہی حال رہا تو لڑائی دیر تک نہیں چلے گی۔ مغلوں کے پوائنٹس بڑھتے جا رہے ہیں۔

(بگل کی آواز)

افوہ! یہ کیا ہونے لگا؟ بادل آئے، آسمان پر اندھیرا چھا گیا، بجلیاں کوند رہی ہیں۔

(بادل کے کڑکنے کی آواز اور بندوقوں کا شور)

یہ دیکھتے بوندا باندی شروع ہو گئی، بلی بلی بھوار پڑ رہی ہے۔ بگل بجائے گئے اور لڑائی بند ہو گئی۔ موسم خوشگوار ہو گیا ہے، اب پھر لوگوں کو سبکیاں آ رہی ہیں، قدرت مرہٹوں کی مدد کو آ پہنچی۔ اتنی دیر میں وہ تازہ دم ہو جائیں گے۔

سارے سپاہی بڑے خیمے کے نیچے کھڑے ہیں، بارش دیر تک نہیں ہے گی۔ لیجئے اتنی دیر تاک۔ آپ ایک ریکارڈ ٹھنٹے۔ ریکارڈ بجاتا ہے۔ برسن لاگی رے بدریا ساون کی — غالباً یہ میاں کی لہار ہے۔

دوسرا ریکارڈ — چھارہ ہی کالی گھٹا جیا مورا لہرائے ہے

(بگل کی آواز)

بارش بند ہو گئی، اسپاٹ اور کپتان میدان کا بغور معائنہ کر رہے ہیں۔ یہ لیجئے انہوں نے میدان کو پاس کر کے فوجوں کو بلا لیا۔ پھر لڑائی شروع ہو گئی مرہٹے بڑے خوش و خروش سے لڑ رہے ہیں اور اس وقت وہ گھمسان

کی لڑائی ہو رہی ہے کہ ہم بیان نہیں کر سکتے۔

چند سپاہی لڑتے لڑتے بالکل ہمارے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں ایک آدھ ہاتھ ہمارے رسید نہ کر دیں۔ آپ اُن کی آوازیں سن سکتے ہیں۔ اوہ! مرہٹے کی تلوار ٹوٹ گئی۔ مغل نے بڑی سپورٹس مین سپرٹ دکھائی اور ایک طرف ہو گیا۔

مرہٹہ۔ ”مارے صاحب!“

مغل۔ ”نہتوں پر حملہ کرنا بہادروں کا شیوہ نہیں۔“
مرہٹے نے جھک کر کہا۔ ”شکریہ!“ اور فوراً نئی تلوار منگائی۔ اتنی دیر مغل دوسری طرف منہ کئے کھڑا رہا۔ غالباً ضبط کرتا رہا۔ نوکر نئی تلوار لے آیا۔ مرہٹے نے تلوار ہاتھ میں لے کر ادھر ادھر ہوا میں وار کئے۔ پھر مغل کو اشارہ کیا اور اس کی ڈھال پر تین چار وار کئے۔ جب اطمینان ہو گیا کہ تلوار مضبوط ہے تو دونوں لڑنے لگے۔ اب وہ لڑتے لڑتے دُور نکل گئے ہیں۔
(بگل کی آواز)

یہ پھر نفیریاں بج رہی ہیں، کہیں سے ڈھول کی آواز بھی آرہی ہے۔
اجاہ۔ ”لنچ انٹرول ہو گیا۔ فوجیں کھانا کھانے واپس جا رہی ہیں۔ فی الحال سم بھی اجازت چاہتے ہیں۔ گھنٹہ بھر آپ کو جنگی ریکارڈ سنائے جائیں گے۔ (ریکارڈ بجتا ہے۔۔ چل چل رے نوجوان۔!)“

اس کے بعد۔ چھائی، پچھم سے گھٹا نوہا لو جاگو۔ وغیرہ وغیرہ
یعنی اب لنچ انٹرول ختم ہونے کو ہے۔ ہم ابھی ابھی خیموں سے آرہے

ہیں۔ مغلوں نے خوب مرغی غذا ایس کھاٹی ہیں۔ میٹھے ٹکڑے تو وہ اس قدر کھا گئے ہیں کہ حیرت ہوئی۔ آخر ان لوگوں کا ارادہ کیا ہے؟ لیکن مرہٹوں نے نہ جانے کس پالیسی کو مد نظر رکھتے ہوئے صرف ذرا ذرا سے چاول پھانک کر صبر کر لیا۔ اب وہ پان کھا رہے ہیں۔ شاید وہ سوچتے ہوں کہ انسان خالی پیٹ اچھا لڑ سکتا ہے۔ لیکن ہمیں اس سے اختلاف ہے۔ طبی نقطہ نگاہ سے بھی جب پیٹ خالی ہو تو دم خم کہاں سے آئے گا؟ جسمانی قوت کا دار و مدار اعلیٰ درجے کی غذا پر ہے، پھر بزرگوں نے بھی کہا ہے کہ بھوکا بیڑ کیا لڑے گا؟ — معاف کیجئے ہم خواہ مخواہ ادھر ادھر کی ہانک جاتے ہیں۔

اب فوجیں آرہی ہیں، فوجوں نے میدان تبدیل کر لیے ہیں۔ مغل پہلے ہماری دہنی طرف تھے۔ اب بائیں طرف آگئے ہیں۔ مرہٹے بھی دوسری طرف چلے گئے۔

(ہگل کی آواز)

یہ لیجئے لڑائی شروع ہو گئی، لیکن یہ کیا ہو رہا ہے؟ مرہٹے بجلی کی طرح تڑپ رہے ہیں اور مغلوں پر چھائے جاتے ہیں۔ شاید یہ خالی پیٹ کا اثر ہے۔ ادھر مغل ہیں کہ بالکل سست پڑ گئے ہیں۔ غالباً پراپھٹوں کا خمار چڑھ رہا ہے ابھی امپراتروں نے کئی سوئے ہوئے مغل سپاہیوں کو جگایا ہے۔ یہ مغل کپتان اشارے سے کمر رہا ہے، اتھاہ! ڈھول والوں کو رہا ہے۔ تبھی ڈھول زور زور سے بجنے لگے۔

(ڈھولوں کی آواز)

سب سپاہی چمک پڑے، جو اُونگھ رہے تھے وہ بھی ہتھیار ہو گئے اور
لڑنے لگے۔ مغل کپتان کی اس دانشمندی کی ہم داد دیتے ہیں، اگر وہ ڈھول نہ
بجواتا تو غالباً ساری فوج قیلولہ کر رہی ہوتی۔

ارے! یہ کیا تماشا ہے؟ بالکل ہمارے قریب ایک نوکر کسی مرہٹہ سپاہی
کو بلارہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ناشتہ دان ہے۔ اس کے بلانے پر دو سپاہی
لڑتے لڑتے ادھر آنکلتے ہیں۔ نوکر ہے کہ بدستور بلارہا ہے۔ دونوں سپاہی
ٹھہر جاتے ہیں۔

مرہٹہ۔ ”کیا ہے؟ — دیکھنا نہیں ہم مصروف ہیں؟“

نوکر۔ ”حضور کھانا —!“

مرہٹہ۔ ”بے وقوف، تجھے آداب حرب و ضرب کی الف بے بھی
معلوم نہیں، ہم جب لڑ رہے ہوں تو کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں
کر سکتے۔ ہمارا وقت ضائع نہ کر!“

مغل۔ ”کیا بات ہے بھئی؟“

مرہٹہ۔ ”حضور! میں ان کا کھانا لایا ہوں۔“

مغل۔ ”کھانا لائے ہو؟۔ اب؟۔ اب؟۔ تو جناب آپ اب تک بھوکے

لڑ رہے تھے؟“

مرہٹہ۔ ”جی ہاں! اس نامعقول نے دیر کر دی۔“

مغل۔ ”افوہ! آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ میں نامد ہوں، اپنے کئے

پر پشیمان ہوں۔ جائے کھانا کھائیے۔ میں اتنی دیر انتظار کروں گا۔“

تنگوئے

مرہٹہ۔ ”اجی صاحب، آپ بھی ساتھ ہی چلے۔!“
مغل۔ ”میں چلوں؟۔ ابھی تو کھانا کھایا تھا۔ خیر!۔ اچھا کیا تھا

لاتے ہو۔۔۔“

نوکر۔ ”حنور! بہت سی چیزیں ہیں، لیکن خاص چیز میٹھے ٹکڑے ہیں!“
مغل۔ ”میٹھے ٹکڑے؟۔ آہ!۔ کس نے کہا میٹھے ٹکڑے؟ خدایا یہ ہیں
کیا سن رہا ہوں؟ کیا سچ پچ میٹھے ٹکڑے ہیں۔ چلے جناب! میں ساتھ
چلتا ہوں۔!“

اور دونوں نوکر کے ساتھ لڑتے ہوئے دُور چلے جاتے ہیں، سامعین!
ہمیں یہاں اختلاف ہے، آخر یہ مغل میٹھے ٹکڑوں کو دیکھ کر بے قابو کیوں ہو
جاتے ہیں؟۔ مانا کہ اچھی مزیدار چیز ہے۔ لیکن ایسی نہیں کہ اسی کا دہم
ہو جائے۔ جہں ایک مرتبہ تجربہ ہو چکا ہے، ایک دعوت میں ہم نے میٹھے
ٹکڑے کھائے اور دیر تک ہمارے پیٹ میں درد ہوتا رہا۔!

اب ہم جنگ کی جانب متوجہ ہوتے ہیں، مغلوں کے پوائنٹس پھر بڑھتے
جا رہے ہیں۔ مرہٹے غالباً تھک گئے ہیں۔ مغل عجب بے نیازی سے لڑ
رہے ہیں۔ غالباً انھیں پتہ چل گیا کہ فتح ان کی ہوگی۔ اگر ان کا یہ خیال ہے تو
وہ خوش فہمی میں مبتلا ہیں، لڑائی اور امتحان کے نتیجے کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔
(گل کی آواز)

یہ غل کیسا مچا؟۔ لڑائی بند ہو گئی۔ آخہ! ٹی انٹال ہے۔ اب
چار بجے ہیں، پندرہ منٹ لڑائی بند رہے گی۔ کچھ دیر کے لیے ہم پھر رخصت

مشورے

چاہتے ہیں۔ اتنے میں آپ مرہٹوں کا فوجی بینڈ سُنے۔
(بینڈ بجتا ہے)

یہ لیجئے، اب جنگ کے منعقد ہونے میں صرف تین منٹ باقی رہ گئے۔
سامعین! ہم ایک بہت بُری خبر سنانے والے ہیں، ہمیں بہت افسوس
ہے۔ جہاں مغلوں نے شربت پیا ہے وہاں مرہٹوں نے جی بھر کر تارڑی پی ہے
اور بھنگ بھی پی ہے۔ اب وہ عجیب عجیب باتیں کر رہے ہیں۔ ہمیں بھنگ
تارڑی اور چرس وغیرہ سے سخت نفرت ہے! — مرہٹوں سے ہرگز یہ اُمید نہ
تھی، فوجیں پھر میدان میں آگئیں۔

(گل کی آواز)

لڑائی شروع ہو گئی، لیکن لڑکون رہا ہے، سب بیزار بیٹھے ہیں، مغل
بیٹھے پستے اور کشمکش مچانک رہے ہیں اور مرہٹوں پر تارڑی کا اثر ہے۔ امپائر
بڑے پریشان ہیں۔ بے چارے ادھر ادھر فتنیں کرتے پھر رہے ہیں کہ لٹڈ
کچھ تو لڑو۔ وہ لیجئے! امپائروں نے دھمکی دیدی کہ اگر لڑائی شروع نہ کی
گئی تو طرفین کو خارج DISQUALIFY کر دیا جائے گا۔ طوہا و کرہا جنگ
آہستہ آہستہ پھر شروع ہو رہی ہے، سپاہی اس طرح لڑ رہے ہیں، جیسے
سی پر احسان کر رہے ہوں۔

اُٹ! یہ مرہٹے کیا کر رہے ہیں؟ آپس میں ہی لڑ رہے ہیں! — چند
مرہٹے بالکل ہمارے پاس کھڑے ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ اُن کی
آوازیں غالباً آپ کو صاف سُناؤں دے رہی ہوں گی۔ سُنے۔

”یار ہمیں کیوں مار رہے ہو؟“

”تو اُدھر کسے ماریں؟“

”اُن کو مارو!“

”اُن کو؟ کن کو؟“

”جن سے لڑنے آئے ہو!“

”لڑنے کس سے آئے ہیں؟“

”پتہ نہیں! — لیکن ہمیں نہ مارو!“

الغرض ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں ہر طرف ہو رہی ہیں۔ اب بیس منٹ باقی ہیں، وہ دیکھتے مرہٹوں کا کپتان آگے بڑھ کر امپائر سے روشنی کی کمی پر اعتراض کرتا ہے کہ اندھیرا ہو گیا ہے اور اچھی طرح لڑا نہیں جاتا، دوست دشمن میں تمیز مشکل ہے۔

امپائر آپس میں مشورہ کرتے ہیں۔ مغلوں کے کپتان سے پوچھتے ہیں۔ بھلا اُسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

(ڈھول بجتے ہیں)

ڈھول بجائے جا رہے ہیں۔ لڑائی ختم! نتیجے کے لئے لوگ بے قرار ہیں۔ سارے سپاہی میدان میں جمع ہیں۔ ہم خود منتظر ہیں! ہمارا خیال ہے کہ مُغل جیتیں گے۔

اے لو! وہ فیصلہ سُنا دیا گیا۔ لوگ نعرے لگا رہے ہیں۔

(شور و غل)

۲۔ عاشق

خواتین و حضرات! سات بچ کر بچپن منٹ ہوئے ہیں۔ ابھی ابھی آپ نے بیویوں کی لڑائی سنی۔ کچھ دیر میں ہم جیتے جاگتے عاشق کو براڈ کاسٹ کریں گے۔ پچھلے ہفتے ہمیں بے شمار شکایتیں آئیں کہ ریڈیو کا پروگرام خشک ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ ہم اس کی تلافی کر رہے ہیں۔ جن صاحب نے ہمیں یہ مشورے دیئے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

آپ نہیں جانتے کہ ہمیں کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور صحیح قسم کے عاشق کی تلاش میں کتنے دنوں مارے مارے پھرے۔ عاشق تو بہت ملتے ملتے لیکن آئیڈیل عاشق نہیں ملتا تھا۔ پرسوں قسمت نے یادری کی اور ہم نے اسے پالیا۔ اب ہم آپ کو کسی شہر کے کسی گوشے کی کوٹھی میں لئے چلتے ہیں۔ کل ہم اس عاشق کے متعلق معلومات فراہم کرتے رہے۔ آج چھپکے سے اسے براڈ کاسٹ کیا جا رہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ عاشق کو خود پتہ نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم اپنی اس حرکت پر پشیمان ہیں لیکن اس کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

یہ لیجئے، اب اصل پروگرام شروع ہوتا ہے۔ ہم جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے ہیں اور ٹکنجی باندھے، عاشق کو دیکھ رہے ہیں جو اس وقت باغ میں ٹہل رہا ہے۔ عاشق کا حلیہ ہم ہرگز نہیں بتائیں گے۔ ویسے بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ پہلے عاشق کا حلیہ جانتی ہے، تو سامعین اس عاشق نے اپنے محبوب کو کبھی نہیں دیکھا۔ فقط اس کی تعریفیں سنی ہیں۔ بس سُن سُن کر ہی فریفتہ ہو گیا ہے۔ اور ہونا بھی پوہنی چاہئے۔

ابھی ابھی ایک ناصح یہاں سے بُرا منہ بنائے گیا ہے۔ عاشق کے بزرگوں نے چند (PART TIME) ناصح رکھے ہوئے ہیں جن کا فرض دن میں دو تین مرتبہ سمجھانا، بچھانا ہے لیکن عاشق اُن سے بُری طرح پیش آتا ہے اور ہمیشہ اُنہیں بھگا دیتا ہے اور اکثر شعر پڑھنے لگتا ہے۔ ابھی ابھی اُس نے ناصح کو ڈانٹتے ہوئے ایک شعر پڑھا تھا جو ہمیں یاد ہے شعر اُن کر ہمارا دل تڑپ اُٹھا تھا۔ آپ بھی سن لیجئے اس نے کہا۔ ۷

اب ضرورت ہے ہم کو عینک کی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

اے، کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کتنا درد ہے اس مصرع میں، یوں تو عاشق ہر وقت کوئی نہ کوئی شعر گلگناں رہتا ہے لیکن اس کے محبوب شعر صرف چند ایک ہیں۔ ملاحظہ ہو: ۷

ہم بھی مُنہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ ذائقہ کیا ہے،

اور دوسرا شعر ہے: ۷

اپنی تصویر سمنے رکھ کر تیرا انجم سوچتا ہوں
سُبْحَانَ اللہ۔ تیرا انجم سوچتا ہوں۔ کیا سوزِ مضمر ہے اس میں، ایک اور شعر ہے جو وہ عموماً آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر گایا کرتا ہے: ۷

اپنی صورت کو دیکھتا ہوں میں
اس کی قدرت کو دیکھتا ہوں میں

شکر ف

عاشق نے پیٹ کے بل لیٹ کر چار آہیں بھریں، اب اُس نے کروٹ لی اور پانچ ٹھنڈے سانس لئے۔ اب وہ سیرِ حالیت کر چاند کی طرف دیکھ رہا ہے اور مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑا رہا ہے۔

اے لو! وہ لپک کر کُرسی پر بیٹھ گیا۔ سامنے میز پر کائنات پڑے ہیں۔ عاشق کیا شاعری کر رہا ہے؟۔ نہیں!۔ اُف! یہ تو تارے گن رہا ہے، آسمان کو دیکھنا ہے اور کاغذ پر پرکار وغیرہ سے نقشہ بنانے لگتا ہے۔ یہیں پتہ چلا ہے کہ عاشق علمِ ریاضی میں ماہر ہے۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ عاشق نے نامہ بر کے ہاتھ ایک پنسل بھیجی تھی کہ محبوبہ کے ہاتھ سے کسی طرح چھٹا لائے، پھر ایک رومال بھیجا کہ محبوبہ اس پر چھینک دے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

سامعین! آپ افسردہ نہ ہوں، سچی محبت میں ایسی باتیں اکثر ہوا کرتی ہیں، دُنیا میں رنجِ دالم نسبتاً زیادہ ہیں۔

یہ کون مسخرہ کر رہا ہے؟۔ اوہ! یہ چارہ گر ہے۔ اُس کے ہاتھ میں چارہ کا سیٹ ہے۔ اگر عاشق چائے نہ پیئے تو اس کا سٹیمین ختم ہو جائے۔ عاشق نے جلد چار پی، چار دانی کو ایک پتھر پر دے مارا، پیالیاں ادھر ادھر پھینک دیں، چھلانگیں مارتا ہوا بھاگا اور گھاس کے ایک قطعے پر لیٹ کر محبوبہ کو یاد کرنے لگا۔ اتوار کے روزِ ریگستان کا پروگرام ہوتا ہے۔ عاشق ایک چھوٹی ٹیسی ٹوکری میں کھانے پینے کی چیزیں، تھرماس اور چند دیوان ساتھ لے جاتا ہے، وہاں صبح سے شام تک صحرا میں بھاگتا، فرضی اونٹوں کا تعاقب کرنا، دھول اڑانا، کانٹوں

پرننگے پاؤں پھرنا اور آہ وزاری وغیرہ کرنے کا پروگرام ہوتا ہے۔
وہ اس نے منہ میں مخترا میٹر لگایا اور گھڑی نکال کر نبض گننا شروع کی۔
مخترا میٹر پڑھا، کاغذ پر ٹمپر پچر لکھا اور نبض درج کی، یہ اس لیے کہ اس سے گرمی
عشق کا اندازہ رہتا ہے۔ اگر ٹمپر پچر یا نبض گر جائے تو ظاہر ہے کہ عشق کا جذبہ
سرد ہونا جارہا ہے۔ چنانچہ جب کبھی یوں ہونے لگتا ہے تو عاشق دُگنے جوش
سے اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔

سامعین! ہم نے یہ چارٹ دیکھا تھا، عاشق کا ٹمپر پچر ایک سو ایک اور نبض
ڈیڑھ سو تک پہنچ چکی ہے۔ ویسے آج صبح بھی ٹمپر پچر خاصا تھا۔ شاید اس لیے
کہ آج عاشق کو زکام ہے۔ اور وہ کچھ بیزار بھی ہے۔
عاشق کے کمرے میں ایک گراموفون ہے اور بے شمار ریکارڈ ہیں۔ نوکر ہر
پندرہ منٹ کے بعد وہ ایک ریکارڈ لگا دیتا ہے۔ خواہ عاشق باغ میں ہو یا
چھت پر۔

چنانچہ اگر آپ اب بھی کانوں پر زور ڈالیں تو مدہم آواز میں ایک ریکارڈ
سُنیں گے۔ (آواز آتی ہے) ط

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
اس کے محبوب ترین ریکارڈ مندرجہ ذیل ہیں :-

”ہم تو تنگ آ کے دُنیا سے مرجائیں گے“
”کسی کو دے کے دل کوئی نوا سِخِ فغاں کیوں ہو“
”تیرے جہاں سے چلے — وغیرہ وغیرہ“

شکونے

ان ریکارڈوں کے نمبر ہیں۔ تین ہزار پانچ سو سترہ سے بیس تک اور یہ آپ کو نیلے گنبد کی دکان سے مل سکتے ہیں۔

عاشق ایک دو بجے کے قریب بستر پر لیٹ جانے لگا۔ جس پر بے شمار سلوٹیں پڑی ہوں گی اور ساری رات آہ وزاری میں گزارے گا۔ خوب کروٹیں لے گا اور شاید ایک دو مرتبہ پلنگ سے نیچے بھی گر پڑے گا۔ پھر صبح صبح اُٹھ کر بھاگتا ہوا دریا کے کنارے جائے گا۔ وہاں پانی کی لہروں سے دل کے راز کھے گا۔ دوپہر تک جنگلوں میں پھرے گا۔ شام کو غروب آفتاب دیکھنے ایک مینار پر چڑھ جائے گا۔ چاندنی راتوں میں عاشق کی صحت بہت گر جاتی ہے۔ جب بارش ہو رہی ہو تو اس کی حالت مخدوش ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات تو ترس آنے لگتا ہے۔ اس کی آہ وزاری سے تنگ آکر اڑوس پڑوس کے تمام ہمسائے مکان خالی کر گئے ہیں۔ اُن میں سے چند ایک تو دیکھا دیکھی عاشق بن گئے چار مہینوں سے عاشق نے سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا۔ تبھی اس کی چار میں اکثر خشک میوے ملتے ہیں۔ آج کل اس کا گزارا چاء پر ہے۔

اچھا سامعین! اب ہم اجازت چاہتے ہیں۔ ایک ننھی سی چڑیا ہمارے کان میں کہتی ہے کہ یہ عاشق اس وقت کیا کرے گا۔ جب اپنی محبوبہ کو سوچ چُخ دیکھ پائے گا۔ نہ تو ہم نجومی ہیں، نہ غیب کی باتیں جانتے ہیں۔ اچھا خدا حافظ

۳۔ مزدور

کچھ دن ہوئے ہم نے ہوا کی لہروں پر چند شخصیتوں کا انٹرویو پیش کیا تھا۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ وہ ضرور مقبول ہوا ہوگا۔ مزدور سے انٹرویو ہوا

سامعین! کبھی آپ نے اس شخص پر بھی غور کیا جسے مزدور کہا جاتا ہے؟۔
 غالباً نہیں! کتنے افسوس کی بات ہے۔ مزدور کے سینے میں بھی دل ہے اور
 اتفاق سے وہ دھڑکتا بھی ہے۔ اس میں جذبہ ہے، احساس ہے، تڑپ ہے
 آج ہم زمانے بھر کی دکھیا اور سماج کی ستانی ہوئی رُوح کی پکار آپ کے
 کانوں تک پہنچائیں گے۔ سامعین! ہم نہیں چاہتے کہ کمزور دل خواتین ونچتے
 اسے ہیں، بیوقوف یہ داسان اس قدر پردہ ہے کہ ابھی سے ہماری آنکھوں میں
 آنسو آرہے ہیں۔ لہذا بہتر یہی ہوگا کہ ننھے مٹے بچوں اور خواتین کو ریڈیو سے
 ہٹا دیا جائے۔

مزدور سے ملک کی تین مقتدر ہستیاں انٹرویو کریں گی۔ پہلے جناب
 نقشین مراد آبادی آئیں گے۔ جو مایہ ناز قومی شاعر ہیں۔ پھر حضرت آواز گرد
 صاحب آئیں گے جو ہندوستان کے چرٹی کے ترقی پسند افسانہ نویس ہیں۔ آخر
 میں پنڈت چرٹی لڑاوا لکھنوی تشریف لائیں گے۔ جن کے متعلق کچھ کہنا اُن کی
 اور اپنی توہین ہے۔ ہم فقط یہ کہیں گے کہ آج کل کوئی سیاسیات پر قادر ہے
 تو وہ پنڈت صاحب ہیں۔

یہ لیجئے مزدور کمرے میں آگیا۔ سلام کرو مائیکرو فون کو بھی مزدور —
 ہاں ہاں — شاباش! — سامعین مزدور کا سلام شوق قبول ہو، وہ لیجئے۔
 نقشین مراد آبادی بھی تشریف لے آئے۔ اب مکالمے آپ خود سنئے۔!“
 (شاعر کی آواز آتی ہے) — ”آ۔ اے غم دیدہ، خمیدہ رُوح کی پکار۔
 مصیبت میں گرفتار۔ اے سماج کے شکار۔ تو ہے اپنی شکست کی آواز“

شکوہ

دل : اے زمانے بھر کے ٹھکراتے ہوئے ۔ سرمایہ داری کے ستائے ہوئے ۔
اور پھر تانکیوں ہے در بدر تو لامتہ پھیلائے ہوئے ۔ !

مزدور : ” ایں ۔ ؟ ”

شاعر : ” سر سے لے کر پاؤں تک سستی سی کچھ چھائی ہوئی ۔ اُف تری کاف
جوانی جوش پر آئی ہوئی ۔ نہیں نہیں یوں نہیں ۔ بلکہ اس طرح ۔ سر
سے لے کر پاؤں تک سستی سی کچھ آئی ہوئی ۔ اُف یہ تیری روح پر بیڑی
سی چھائی ہوئی ۔ اب ٹھیک ہے ۔ بول اے فراحقاں ۔ ننگ
خاندان ۔ سیدھے سادے دہقان ۔ بھولے بھالے انسان ۔ بول !

مزدور : ” جناب کم از کم گالیاں تو نہ دیجئے ۔ ! ”

شاعر : ” آہ ناداں ! انہیں گالیاں سمجھتا ہے ۔ آہ ناداں ۔ اُف ناداں ۔ ماتے
نادان ۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر فحاش کر گیا ورنہ گلشن میں علاج ٹنگی داماں بھی ہے
مزدور : ” جناب کسی آسان سی زبان میں باتیں کیجئے ، میرے پتے کچھ نہیں
پڑ رہا ۔ ! ”

شاعر : ” تمہارے ابا کیا کرتے تھے ؟ ”

مزدور : ” مزدور تھے ۔ ! ”

شاعر : ” اور دادا ۔ ! ”

مزدور : ” اور بیٹا ۔ ؟ ”

شاعر : ” وہ بھی مزدور ہے ۔ ! ”

شاعر۔ ”سبحان اللہ!۔ تمہارا خاندان ہی مزدوروں کا ہے، میں تو مزدوروں پر جان چھڑکتا ہوں۔ ہمارا سب خاندان مزدوروں پر مڑنا ہے۔ میں نے کیا کہا تھا؟۔ مڑنا ہے!۔ ہاں!۔ ایک شعر عرض ہے۔

تیرے سب خاندان پر عاشق میرا سب خاندان ہے پیارے!

مزدور۔ ”کیا کہا؟۔ پھرے کہنا ذرا۔ دیکھئے صاحب میں۔!“

شاعر۔ ”بس بس!۔ ہشت! اچھا! کبھی وہ شعر بھی سنا۔“

جس کھیت سے دہقان کو تیسر نہیں روزی

اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو بھلا دو

سنا ہے کبھی یہ شعر۔“

مزدور۔ ”نہیں سنا۔!“

شاعر۔ ”اور جب رات کی سیاہی رخصت ہوتی ہے اور صبح کا نور آسمان سے

زمین تک لہری مارتا ہے تو اُس وقت تم کیا کرتے ہو؟“

مزدور۔ ”کیا فرمایا آپ نے؟“

شاعر۔ ”یعنی صبح کو کیا کرتے ہو؟“

مزدور۔ ”میں درزش کرتا ہوں صبح اٹھ کر!“

شاعر۔ ”درزش؟۔ چچ چچ۔!“ اور جب آفتاب عین نصف النہار

پر ہوتا ہے اور زمین پر اپنی تیز کرنیں پھینکنے سے باز نہیں آتا، دوپہر

کی جلیلائی دھپ میں کن مشقتوں سے دوچار ہوتے ہو؟“

مزدور۔ ”جایا کرتا ہوں۔!“

شاعر۔ ”اور جب شام کے دلفریب لمحے دن بھر کے تھکے ماندوں کو مسرت کا پیغام سناتے ہیں، اُس وقت کس مصیبت میں گرفتار ہوتے ہو؟“
مزدور۔ ”اکھاڑے میں ورزش کرتا ہوں۔!“

شاعر۔ ”ورزش! ورزش!!۔ ہم بھی ورزش کرتے ہیں لیکن ڈینگیں نہیں مارتے نہہاری طرح!۔ صبح اٹھ کر ہم دو ڈنٹر پیلتے ہیں، پانچ بیٹھکیں نکالتے ہیں اور پندرہ مرتبہ لمبے لمبے سانس لیتے ہیں۔ شام کو ہم پچاس قدم تیزی سے چلتے ہیں۔!“ (اناؤنسر کی آواز)۔ ”ہیں افسوس ہے نقشین صاحب نے اتنی دیر بھی لگائی اور ایک بات بھی کام کی نہ کی، خفا نہ ہوں نقشین صاحب! ہم بات خدا لگتی کہتے ہیں۔ آہ!۔۔۔ ہیں ایک شعر یاد آگیا۔

بات سچی ہے بے زلگتی میں کہوں گا مگر خدا لگتی۔!

اچھا! آوارہ گرد صاحب! اب آپ تشریف لے آئیے۔ آوارہ گرد صاحب کے افسانے محض مزدوروں کے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ مزدوروں کی رگ رگ سے واقف ہیں اور مزدور ان کی رگ رگ سے۔ لیکن آوارہ گرد صاحب! یاد رہے کہ سوالات نیچے ٹپے ہوں۔ مختصر ہوں اور

بامعنی ہوں۔ اور آج آئیے۔ یہ لیجئے اب آپ خود سُنیے!“
آوارہ گرد۔ ”بھٹی مزدور! جب تم کسی امیر آدمی کو دیکھتے ہو گے تو تمہارا خون ضرور کھولنے لگتا ہوگا۔“

مزدور۔ ”نہیں تو۔!“

ادیب - "نہیں۔؟ غضب خدا کا!۔ اور جب تم کسی خوش پوش شخص کو موٹر میں دیکھتے ہو تو سماج پر لعنت ملامت نہیں بھیجتے۔؟"
مزدور - "سماج کیا ہوتا ہے؟۔ اور میں کبھی کسی کو گالی نہیں دیتا۔ یہ بہت بُری بات ہے!"

ادیب - "تمہیں خیال تو آتا ہوگا کہ یہ شخص موٹر میں کیوں بیٹھا ہے۔!"
مزدور - "اس لئے کہ اس کے پاس موٹر ہے۔!"
ادیب - "اُوں ہوں!۔ وہ تو ٹھیک ہے، لیکن آخر کیوں ہے اس کے پاس موٹر۔؟"

مزدور - "اس نے موٹر خریدی جو ہے۔!"
ادیب - "تم سرمایہ داری کی اس لعنت پر نفرت کی بوجھاڑ ڈالتے ہوئے مساوی حقوق کے لیے کوشاں ہونا اپنا فرضِ اولین تصور نہیں کرتے۔؟"
مزدور - "قسم لے لو جو ایک لفظ بھی سمجھ میں آیا ہو۔ ابھی وہ دُبے پتلے سے آدمی بھی ایسی ہی باتیں کر رہے تھے۔!"

ادیب - "مثلاً تم یہ نہیں سوچتے کہ آخر امیر، امیر کیوں ہیں؟ اور غریب غریب کیوں ہیں؟ سارے امیر غریب کیوں نہیں بن جاتے؟۔ اور غریب امیر کیوں نہیں ہو جاتے؟ تاکہ جو غریب غربت میں غریبی کے متعلق غریبانہ۔!"

(اناڈنسر کی آواز) - "آوارہ گرد صاحب! افسوس ہے کہ ہم آپ کو ٹوک رہے ہیں۔ بعد آپ غریبی کی گردان کیوں کر رہے ہیں؟"

شکوے

ادیب۔ "افوہ! معاف کیجئے! ہاں بھئی مزدور تم امیر آدمیوں سے دل میں دشمنی ضرور رکھتے ہو گے!"

مزدور۔ "نہیں! دل میں کبھی کسی سے دشمنی نہیں رکھنی چاہئے۔ دل صاف ہو تو اچھا ہے۔ اور پھر سارے انسان برابر ہیں۔"

ادیب۔ "تم عجیب و غریب مزدور ہو۔ نہ تم سماج کے خلاف ہو نہ سرمایہ دار کو برا کہتے ہو۔ امیروں سے بھی نفرت نہیں کرتے۔ تعجب ہے، اب خاک پر چھپوں تم سے؟"

(اناؤنسر کی آواز) اچھا آوارہ گرد صاحب! آپ کا اندیو ختم ہوا۔ اب پنڈت چڑھی لڑوا صاحب آ رہے ہیں۔ آخر میں مزدور چند الفاظ میں اپنی درد بھری داستان سنائے گا۔ سامعین! ہم ایک مرتبہ پھر یاد دہانی کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ اگر کمزور دل خواتین یا بچے ریڈیو سن رہے ہیں تو انھیں براہ کرم دوسرے کمرے میں بھیج دیجئے۔ مزدور کی کہانی اس کی اپنی زبانی اتنی غم ناک ہے کہ پنڈت صاحب نے ابھی سے رونا شروع کر دیا ہے۔ آجائے پنڈت صاحب! رویئے مت! آپ کی صحت پر بُرا اثر پڑے گا۔ اور بھئی مزدور یہ تم چلوڑے وغیرہ بعد میں چالینا، عجب بے صبری آدمی ہو تم بھی۔ پنڈت جی تمہاری حالت پر رو رہے ہیں اور تم ہو کہ مُنہ چلا رہے ہو۔ سامعین سنئے!"

پنڈت جی۔ (گر جتنی ہوئی آوازیں رک رک کر)۔ "اے ہندوستانی قومیت

کے پرستار — ہم تجھے سلام کرتے ہیں — !

مزدور — "وعلیکم السلام !"

(اناؤنسر) — "ہشت !"

پنڈت جی — "ہاں ! اے ہندوستانی قومیت کے پرستار، ہم تجھے سلام کرتے ہیں — اے ہندوستانی تہذیب کے علمبردار — !"

مزدور — "میں نمبردار نہیں ہوں — میں تو — !"

پنڈت جی — "مت ٹوک مجھے — یہ لفظ نمبردار نہیں تھا بلکہ علمبردار تھا۔ آہ !

تمہارے بھولے پن نے میرے دل پر رقت طاری کر دی۔ میرے قلب میں

انتشار پیدا کر دیا۔ تمہارے دل میں ایک انقلاب کی خواہش کروٹیں نہیں لیتی

کبھی تمہارے سینے میں گدگدیاں نہیں اٹھتیں — نہیں اٹھتیں کیا؟"

مزدور — "جناب سینے میں نہیں گدگدیاں تو پیٹ میں ہوا کرتی ہیں — !"

پنڈت جی — "اُف اُن گدگدیوں کا ذکر کون مسخرہ کر رہا ہے۔ میں دل کی گدگدیوں

کا ذکر کر رہا ہوں، وارداتِ قلب کا ذکر ہو رہا ہے۔ میرے بھولے بھالے

کا مریڈ تم ضرور انقلاب چاہتے ہو گے۔ ہم خود انقلاب چاہتے تھے، چاہتے

رہے ہیں — چاہتے ہیں، چاہیں گے اور چاہتے رہا کریں گے۔ اور

اس انقلاب میں ہم تمہیں لڑائیں گے — آہ ! مزدور لڑیں گے۔ ہم

تماشہ دیکھیں گے۔ فضاؤں کے پرچے اڑ جائیں گے۔ دل سہم جائیں

گے۔ اناؤنسر صاحب ذرا ایک گلاس پانی منگا دیجئے — ہاں ! انقلاب

چاہتے ہونا — سچ سچ بتاؤ۔"

شکریہ

مزدور۔ ”نہیں جناب میں بے قصور ہوں، بالکل بے گناہ ہوں۔ میں نے کبھی ایسی خطرناک باتیں نہیں سوچیں، مجھے معاف کر دیجئے۔!“
 پنڈت جی۔ ”پھر وہی بھولپن دکھا رہے ہو۔ میرے جگر می دوست۔ میں تمہارے راز سے واقف ہوں۔ سمجھ لو کہ۔“

سرفروشی کی تمّت اب ہمارے دل میں ہے
 دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قتل میں ہے
 مزدور۔ (گہرا کر) ”صاحب آپ میری تلاشی لے لیجئے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔!“
 پنڈت جی۔ ”مجھے ہنسنے کی اجازت دو۔ ہا ہا ہا۔ ہی ہی ہی۔ ہو ہو ہو، کامریڈ۔ کس قدر سادہ لوح ہو تم۔ اور جب وہ انقلاب آجائے گا تو پھر ہماری مشکلات حل ہو جائیں گی۔ موجودہ کساد بازاری دفع ہو جائے گی، سرت و شادمانی کی لہر ملک کے گوشے گوشے میں دوڑ جائے گی، یا تو سب باشندے غریب ہی ہوں گے یا سب کے سب امیر ہوں گے۔ اور یا یہاں باشندے ہوں گے ہی نہیں۔!“

(اناؤنسر) ”یہ لیجئے پانی کا گلاس پنڈت جی، گستاخی معاف، یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“

پنڈت جی۔ ”ادہ!۔ وہ شعر مئے ہیں آپ نے؟“

اکثر بہک جاتا ہوں میں مُنہ آئی بُک جاتا ہوں میں
 ایسا شرابی ہو گیا عقل و حسد کو کھو گیا
 مجھ کو زمانے سے غرض پینے پلانے سے غرض!

آؤ!۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔؟“

اناؤنسر۔ ”اُف! پنڈت جی خدا کے لئے بے ہوش مت ہوئیے۔!“

پنڈت جی۔ ”آئے ہائے! اناؤنسر صاحب رہا نہیں جانا۔ کیا کروں؟“

اناؤنسر۔ صبر سے کام لیجئے۔ خدا کے لئے پنڈت بی۔!

(دھڑام سے کوئی گرتا ہے)

اناؤنسر۔ ”سنا آپ نے، پنڈت چڑی لڑا ادا صاحب کیا تو ابھی ہنس ہنس کر

رہے تھے اور کیا بے ہوش ہو گئے ہیں زندگی کا کیا اعتبار ہے۔ ہمیں ایک

شعریاد آیا ہے۔ لیکن یہ شعر سنانے کا موقع نہیں۔ اس لئے رہنے دیتے ہیں۔

ابھی ایک ڈاکٹر بلایا ہے۔ خاطر جمع رکھئے۔ پنڈت جی کو ایسے دورے اکثر

پڑا کرتے ہیں۔ کیوں نہ ہو ملک کے صدمے سہہ سہہ کر دل بالکل چھوڑا سا

رہ گیا ہے۔ بعض اوقات تو ہمیں شبہہ ہوتا ہے کہ پنڈت جی کا دل سوچ

بچا رہا ہے۔ گھس گھس کر غائب ہو چکا ہے۔ لو بھئی مزدور تم اپنی تقریر

شروع کر دو۔ ادھر آؤ۔ اس طرف۔ ہاں ہاں۔ شراؤ نہیں۔

اپنی زندگی کی ناکامیوں پر روشنی ڈالو۔!“

مزدور۔ ”جناب! میں ایک تندرست آدمی ہوں، صبح شام ورزش کرتا

ہوں۔ اچھی غذا کھاتا ہوں۔ جی بھر کر سوتا ہوں، اکھاڑے میں بھی جاتا

ہوں اور اچھے اچھے پھٹوں کو بچھاڑ لیتا ہوں۔ پانچ چھ گھنٹے مزدوری

کرتا ہوں، دن بھر کے لئے کافی مل جاتا ہے۔ بلکہ کچھ بچ ہی جاتا ہے۔

یہ عجیب سے لوگ مجھے بہلا کر یہاں لے آئے ہیں اور عجیب عجیب

شکر

باتیں پوچھ رہے ہیں۔ میں ناشکرا نہیں، نہ میں کسی امیر کی پروا کرتا ہوں نہ غمخوار کی۔ نہ میں کسی کو بُرا بھلا کہتا ہوں۔ میری صحت ایسی ہے کہ جتنے آدمی یہاں بیٹھے ہیں۔ ان سب کو گرا سکتا ہوں۔ مجھے بولنے دیجئے۔ یہ دیکھئے ان لوگوں نے دھینگا مٹی شروع کر دی ہے۔ ارے۔۔۔ ذرا۔۔۔“

”اُف سامعین! ہمیں معاف فرمائیے۔ ہم نادم ہیں۔ اس مزدور نے تو سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ پروگرام بالکل خراب ہو گیا۔ حضرت نقشبین مراد آبادی نے سوال کام کے نہیں کئے۔ آوارہ گرد صاحب چڑ گئے، پنڈت جی بے ہوش ہو گئے اور یہ مزدور کشتی لڑنے کو تیار ہے۔ ہم شرمندہ ہیں۔ اچھا۔ اب ہم قبل از وقت یہ فیچر ختم کرتے ہیں اور دعوہ کرتے ہیں کہ اس کی تلافی عنقریب کر دی جائے گی۔ جب ہم بقیہ مشورے پیش کریں گے، عنوانات ملاحظہ ہوں:-

ایک قدرتی نظارہ

چنگھٹ

ایک اوپریش

ایک خفیہ جلسہ

اور ایک آدھ انٹرویو بھی کر ادیں گے۔ اچھا آداب عرض!

دیکھئے صفحہ فلاں

آرام کرسی پر بیٹھ کر (بلکہ لیٹ کر) کوئی دلچسپ افسانہ پڑھا جا رہا ہے۔
 کچھ معلوم نہیں چاروں طرف کیا ہو رہا ہے۔ کمرے میں آہٹ ہے تو قالین پر کتا پھر
 رہا ہے یا تلی، یا کہیں پڑوس کے مالی کی بکری ہی تو نہیں۔
 یہ بھی معلوم نہیں کہ اب کیا بج رہا ہے اور کتنے بجے سے کالج میں لیکچر شروع
 ہوگا (یا کب سے شروع ہو چکا ہے) اور ابھی ابھی جو جلتا ہوا سگریٹ پھینکا تھا،
 وہ کہیں قالین پر تو نہیں رہ گیا۔ آنکھیں کچھ مُندی مُندی سی ہیں۔ کچھ خواب سے
 دیکھے جا رہے ہیں۔ ایک داستانِ محبت ہے کہ سامنے کھلی ہوئی ہے۔ یہ شبہ
 یقین میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے کہ واقعی محبت بھی کوئی بڑی شدید قسم کا جذبہ ہے
 اور جس کسی کو محبت ہو جائے اس جیسا خوش قسمت اس پاس نہیں ملتا۔ یہ
 خدا کی دین ہے جسے وہ محبت عطا کرتا ہے تو بس چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ تلاش
 کرنے پر تو یہ ملتی نہیں، لیکن اگر چمٹ جائے تو کبل کی طرح بیچھا نہیں چھوڑتی۔
 آہا ہا ہا — منہ میں پانی بھر آتا ہے!

خیالات بھی افسانے کے کرداروں کے ساتھ ساتھ گھوم رہے ہیں۔ جب

دیکھئے صفحہ فلاں

دردناک حصہ شروع ہوتا ہے تو مرنے لگتا جاتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو آتے ہیں، ایک آدھ آہ سرد بھی کھینچ لی جاتی ہے۔ ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی بنجار چڑھے گا اور پھر جب محبت کی فتح کا وقت نزدیک آتا ہے تو آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوتا ہے۔ چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ سر کسی نامعلوم نال پر ہٹنے لگتا ہے۔ طبیعت میں جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ کسی سے لڑنے کو جی چاہتا ہے۔ غرضیکہ اسی طرح افسانے کی ایک ایک سطر کے ساتھ پینتڑے بدلے جاتے ہیں۔! انہی خیالات میں دھڑکنا شروع ہوتا ہے کہ ایک زوردار کڑاکے کے ساتھ بجلی گرتی ہے۔ یک لخت طرفان آتا ہے۔ چلا جاتا ہے۔ پھر آنکھوں کے سامنے ایک خلا چھا جاتا ہے۔ ایک وسیع خلا! خیالات منتشر ہو جاتے ہیں۔

یہ سارا سلسلہ کچھ اس طرح منقطع ہو جاتا ہے جیسے سینما مال میں فلم ایکسپوزٹ ٹوٹ جائے۔ نیچے لکھا ہوا ہے۔ "باقی دیکھئے صفحہ فلاں پر"۔
خدایا یہ کیا ہو گیا؟ بنا بنا یا کھیل بگڑ گیا۔

لیکن قہر درویش بر جان درویش! سب کچھ سہنا پڑتا ہے اور "صفحہ فلاں" کھول کر پھر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں لیکن اس مرتبہ وہ جوش و خروش ہرگز باقی نہیں رہتا۔

بعض اوقات تو ایسے موقعوں پر نہایت وحشیانہ خیالات آنے لگتے ہیں۔ کئی مرتبہ ہونٹ دبا کر کہتے کہ جاتے ہیں، اور ایسے ایسے منصوبے باندھے جاتے ہیں جن کا ذکر کرنا خالی از خطہ نہ ہوگا۔

شگوفے

مثلاً ایک دل بلا دینے والا خونچکاں افسانہ پڑھ رہے ہیں :-
میر وٹن نے پیار سے کہا :- یوں مال مٹول کرنے سے فائدہ ! میں ہمیشہ
سچے انسان کو پسند کرتی ہوں۔ آپ جو مجھ سے کمینچے کمینچے سے رہتے ہیں، اس
کی وجہ دریافت کرنا چاہتی ہوں۔ اصل بات کیا ہے۔ خدا کے لئے صاف
صاف بتا دیجئے :-

میر وٹن نے کہا :- ”آہ ! یوں کہوں تو بھی مشکل، دوں کہوں تو بھی مشکل۔ تم
مانو گی نہیں !“

میر وٹن بولی :- ”یہ آپ میں اتنی تبدیلی کیسے آگئی۔ التجائیں کر رہی ہوں۔
پھر بھی آپ نہیں بتاتے۔“

میر وٹن بولا :- ”اچھا تو لوسن لوصاف کہے دیتا ہوں۔ لیکن کیسے بتاؤں۔
اچھا لوسنوں۔ میں کس طرح تمہیں سمجھاؤں کہ۔“

دیکھئے صفحہ فلان پر

خیر صاحب ! جلدی جلدی وہ صفحہ کھولا جا رہا ہے۔ دل میں وہ فقرہ گونجتا
رہتا ہے۔ میں کس طرح تمہیں سمجھاؤں کہ۔ میں کس طرح تمہیں سمجھاؤں کہ۔
آگے آتا ہے۔ ”میں خود اصلی یا قوتی کے استعمال سے مستفیض ہو
چکا ہوں۔ دنیا بھر کے ڈاکٹر میرے مرض کو تپ دق بتاتے تھے۔ میں بالکل ہڈیوں
کی مالا بن گیا تھا اور اب بفضل خدا قابل رشک صحت کا مالک ہوں۔!“

طبیعت میں اُجھن سی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کیا ہو گیا؟ اس کا انسانے سے
تو کوئی تعلق نہیں۔ اظہارِ محبت سے اسلی یا قوتی کا کیا واسطہ؟

صفحات کی جانچ پڑتال جوں باقی ہے تو بڑی کونت ہوتی ہے۔ یہ تو کوئی اشتہار تھا۔

بعض اوقات افسانہ پڑھتے وقت اس آنے والے خطرے سے دل اچانک دھڑکنے لگتا ہے کہ کہیں یکلخت یہ حادثہ پیش نہ آجائے اور جہاں افسانے کا کوئی دلچسپ حصہ آتا ہے۔ اس وقت تو بس جل تو جلال تو آئی بلا کو مال تو کی قسم کا درد شروع ہو جاتا ہے کہ اے پاک پروردگار۔ کہیں دیکھئے صفحہ فلاں نہ بیچ میں آچکے، اور اگر یونہی ہونا لکھا ہے تو ذرا دیر میں آئے۔ جب یہ دلچسپ حصہ ختم ہو لے۔

کتنی ہی مرتبہ مسلسل ناکامیوں سے دل بیزار ہو گیا ہے اور ان لگاتار بیزاروں نے مجھے افسانوں کے معاملے میں ایک حد تک قنوطی بنادیا ہے۔ افسانے کی سُرخی دیکھتے ہی میرے دل میں بے ثباتی عالم کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ سوچتا ہوں کہیں اس افسانے کا حشر بھی وہی نہ ہو جو اتنے افسانوں کا ہر تے دیکھا۔

میں نے کیسے کیسے جتن کئے ہیں؟ مثلاً یہ کہ سب سے پہلے افسانے کے عنوان سے لے کر اختتام تک سارے صفحات کا جائزہ لیا۔ اگر افسانے میں دیکھئے فلاں صفحہ نہیں ہے (یہ نعمت بہت شاذ ہے) تو فوراً کانپتے ہاتھوں اور دھڑکنے والے دل کے ساتھ اس افسانے کو جلد جلد پڑھ لیا۔ ایسے مسرور لمحات پر بار بار خوشی کے آنسو بہائے ہیں، لیکن جلد ہی پوچھنے ڈالے۔ کیونکہ ایسی خوشی دیر پا نہیں ہوتی اور اگلے افسانے میں ضرور کچھ نہ کچھ ہوتا ہے۔

اس کے بعد اُن افسانوں کا انتخاب ہوتا ہے جن میں دیکھئے صفحہ دو مرتبہ

شگرف

ہو یا زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ ہو جلدی سے دو انگلیاں اُن صفحات میں رکھ لیں اور روانی قائم رکھنے کے لیے ادھر آخری پیرے کو دو تین مرتبہ پڑھا اور پھر بڑی پھرتی سے (جس کی مشق کافی دیر میں ہوتی ہے) بقیہ حصہ نکالا اور جلدی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ یوں کرنے رفت اکثر بلند آواز سے پڑھنا پڑتا ہے۔ اور جن افسانوں میں دیکھئے صفحہ پانچ چھ مرتبہ ہو، تو انہیں زندگی کے صرف اُن لمحات کے لیے وقف کر رکھتا ہوں جب انسان انسانہ پڑتے بغیر نہ رہ سکے کئی مرتبہ ایسے افسانے بھی دیکھے ہیں جن میں افسانہ کم ہوتا ہے اور دیکھئے صفحہ فلاں زیادہ!

رومانی افسانے تو ایک طرف، علمی مضامین اور ڈراؤنی کہانیاں بھی اس دیکھئے صفحہ فلاں کی دست برد سے نہیں بچتیں۔ مثال کے طور پر کسی سُراغ رسانی کے افسانے کو لیجئے :-

”اندھیری رات تھی، بارش نے سوچ رکھا تھا کہ آج ہی برسوں کی قبرستان کا منظر۔ ہوا کے تھپیڑے، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑی مصیبت ٹوٹنے والی ہے۔“

— یہ پڑھ کر دل پر تھوڑا سا خوف ضرور طاری ہونے لگتا ہے۔ خصوصاً اگر اندھیری رات میں افسانہ پڑھا جائے اور ساتھ ساتھ بارش بھی ہو رہی ہو۔
— ”مزم بھاگا، اس کے پیچھے پیچھے کانٹیل تھا۔ اس قسم کے تعاقب کا اتفاق کانٹیل کو کبھی نہ ہوا تھا۔ مزم کے پاؤں میں گویا پیسے لگے ہوئے تھے۔ کانٹیل نے چلا کر کہا۔“ بد معاش تو بچ کر کہیں نہیں جاسکتا۔ میں سیٹی

دیکھئے صفحہ فلاں

بجائنا ہوں، ابھی سینکڑوں سپاہی تجھے گھیر لیں گے۔

”مزم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اُس نے قلاںچ بھری، برساتی نالے کو پھلانگ گیا اور لپک کر سامنے کی اُونچی دیوار پر چڑھ گیا۔ بھاری بھر کم کانسیبل پھاند نہ سکا اور وہیں رُک گیا۔ مزم نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے چلا کر بولا کہ:-

باقی دیکھئے صفحہ فلاں پر

دل پر بدستور ڈر حاوی ہے، صفحہ تلاش کرتے وقت آخری فقروں کو دہرایا جا رہا ہے۔ بقیہ صحت ل جاتا ہے۔ آخری فقرہ دوبارہ پڑھا جاتا ہے۔ ہاں تو مزم نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے چلا کر بولا کہ ”خط و کتابت کرنے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیکھئے“ یہ کیا تماشا ہے؟ کہاں تو مہمے بیٹھے تھے اور کہاں کچھ ہنسی آجاتی ہے۔ مزم کانسیبل سے کہہ رہا ہے کہ نمبر خریداری کا حوالہ دیکھئے۔

دوبارہ دیکھتے ہیں کہ کہیں غلط تو نہیں پڑھ لیا۔ خاصی چچان بین کے بعد پتا چلتا ہے کہ واقعی کچھ اور پڑھ لیا ہے۔ اب جو افسانے کو پڑھتے ہیں تو وہ مزم کا پُر لطف فقرہ بھولتا ہی نہیں۔ ہنسی ہے کہ زبردستی آرہی ہے۔ بس افسانہ ختم۔ اب کوئی سنجیدہ سا مضمون لے بیٹھتے ہیں۔ سقراط پر مقالہ ہے اور خوب ہے! دفعۃً پتا چلتا ہے کہ سقراط واقعی بہت بڑی ہستی تھی اور اب تک ہم بالکل اندھیرے میں رہے ہیں۔ جو ہم نے اس عظیم روح پر کبھی فائزہ تک نہ پڑھی، اپنی بے بضاعتی پر افسوس ہونے لگتا ہے۔

پھر سقراط کو زہر دیئے جانے کا سین آتا ہے۔ دل پر بڑا اثر ہوتا ہے۔

چہرہ لمبا ہو جاتا ہے۔ سگراہٹ (مزم کے فقرے والی سگراہٹ)۔ کی سگرائیں
دور ہو جاتی ہیں۔ یکلخت انکشاف ہوتا ہے کہ دنیا فانی ہے۔ یہاں سب کو مرنا بھی
ہے۔ فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں: "سقراط نے پہلے تو اپنے دشمنوں کو بڑے
سکون سے دیکھا۔ اُس کے پُر نور چہرے کا جلال کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ وہ بالکل ہراساں
نہ تھا۔ دشمنوں کا پتا پانی ہو چلا تھا۔ سقراط نے ایک چھٹیک ماری اور کہا، "تسکر
ہے پھر زہر کا پیالہ ہاتھ میں لے کر گرجتی ہوئی آواز میں بولا۔

باقی دیکھئے صفحہ فلاں پر

جلدی سے کھول کر پڑھا! ماں تو سقراط نے گرجتی ہوئی آواز میں اپنے
دشمنوں سے کہا کہ "اگر آپ سالنامہ مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو سالانہ چندہ
پیشگی بھیج دیجئے۔" یہ کیا مصیبت ہے، پھر واپس پہنچے۔ اس مرتبہ بڑے احتیاط سے
سب کچھ دیکھا۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ ایسے وقت۔ پھر آہستہ
سے وہ صفحہ کھولا۔ اب جو پڑھتے ہیں۔ سقراط نے گرجتی ہوئی آواز میں اپنے
دشمنوں سے کہا کہ "ہمیشہ عبداللہ سگریٹ پیا کرو۔" تو بھٹا کر رسالہ پٹخ دیا۔
اگر محض اتنا ہی ہر کہ دیکھئے فلاں صفحہ کے ساتھ اس صفحے پر صرف اسی مضمون کا
بقیہ حصہ ہو تو کوئی بات بھی ہے۔ اب ایک صفحے پر تین چار چھوٹے چھوٹے تراشے
مضامین کے ہیں۔ چند بیش قیمت نصیحتیں خریداروں کو دی گئی ہیں۔ ایک
آدھ اشتہار بھی ہے۔ اب بتائیے کیا پڑھیں اور کیا نہ پڑھیں!

یا تو یوں ہو کہ کھولے صفحہ ۱۹ دیکھئے وسط کا حصہ ڈھونڈیئے دوسرا کالم

اور پڑھئے گیارھویں سطر۔

دیکھئے صفحہ فلاں

شاید اس کا ایک نام بھی ہے۔ کسی بیکار سے افسانے کو پڑھتے پڑھتے جب نہایت خشک حسہ آجانے اور جی چاہے کہ چینگو سے ایک طنز تب ضمیر ڈانٹتا ہے کہ خبردار! یہ آرٹ کی توین ہے۔ اگر اتنے جی بیزار تھے تو شروع کیوں کیا تھا۔ اب شرائط اسی میں ہے کہ اسے لفظ بہ لفظ پڑھ کر ختم کرو۔ اس وقت انسان بہانے ڈھونڈنے لگتا ہے اور سب سے معقول بہانہ یہی ہے۔ جہاں مترادف دیکھئے فلاں صفحہ آئے۔ وہاں ایک آرٹ کے شیدائی کو پورا حق حاصل ہے کہ بے شک رسالے کو انجیکشن میں ڈال دے یا اگر گرمیاں ہوں تو کھڑکی سے باہر پھینک دے اور اگر ضمیر ذرا سا بھی نولے تو آٹا اسے ڈانٹ دے۔

لوگ اکثر کھا کرتے ہیں کہ جب میں اسمبلی میں پہنچوں گا تو یہ کروں گا۔ اگر بڑا آدمی بن جاؤں تو یہ منوا کر مٹوں گا۔ اگر لیڈر بن گیا تو یوں سے یوں ہو جائے گا۔ مجھے تو یہی دھن ہے کہ اگر کسی روز اتفاق سے بڑا آدمی بن گیا (واضح ہو کہ میں اپنے قد پر قانع ہوں اور بڑے آدمی سے میرا اشارہ طول و عرض کی جانب ہرگز نہیں)۔ چنانچہ اگر میں کبھی بڑا آدمی بن گیا تو سب سے پہلے اس دیکھئے صفحہ فلاں کے خلافت آواز بلند کروں گا کہ کسی کو کیا حق ہے کہ ایک لکھن سے افسانے یا مضمون کی تنکا بولی کر کے رک دے اور پھر جیسا کہ بعض مصنفین نے کہا ہے۔ (بہت سے آج کل بھی کہتے ہیں) کہ مضامین جگہ کے ٹکڑے ہوتے ہیں تو اس صورت میں تو یہ ایکسا اچھا خاصا جرم بن سکتا ہے۔

انجمن ترقی ادب کے سیکرٹری

تسکونے

جب ”دیکھئے صفحہ فلاں مُردہ باد“ اور ”دیکھئے صفحہ فلاں ہائے ہائے“ کے نعرے بچے بچے کی زبان پر ہوں گے پھر افسانے سالم چھپا کریں گے۔ مسلسل ہوں گے اور پڑھنے والوں کو ہرگز یہ مشکلات پیش نہ آئیں گی۔ جب تک اس قسم کا قانون نہیں بنتا، سمجھ لیجئے کہ دیکھئے فلاں صفحہ بھی کہیں نہیں جانے کا اور اسی طرح مدرن ہمارے سینوں پر مونگ دے گا۔

ایک مشورہ یہ بھی پیش کیا جاسکتا ہے کہ اگر ضرور ہی ایک افسانے کو کئی حصوں میں تقسیم کرنا منظور ہے اور اس کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا تو اس خشک سے فقرے کی جگہ بہتر فقرے بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ یہ سخت ساناں شہی حکم بار بار اچھا نہیں لگتا۔

جہاں مضمون کا کوئی حصہ ختم ہوتا ہو۔ وہاں لائم الفاظ میں پڑھنے والے درخواست کی جائے کہ چونکہ اس صفحے پر جگہ مختصر ڈی تھی اور دوسرے صفحے سے نیا مضمون لازمی طور پر شروع ہونا تھا اس لئے اگر وہ مناسب سمجھے تو فلاں صفحہ کھول لے۔ مثلاً

”اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو کم از کم فلاں صفحہ ہی کھول لیجئے۔“

یا

”گستاخی معاف! کیا آپ ہمارے لئے فلاں صفحہ نہ کھولیں گے؟“

یا

”صفحہ فلاں کو ملاحظہ فرما کر مدیر و میجر رسالہ ہذا و عملہ متعلقہ رسالہ

ہذا و فاضل مضمون لگا۔۔۔ سب کو ممنون فرمائیے۔ شکریہ!“

شیطان

اس رات اتفاق سے میں نے شیطان کو خواب میں دیکھ لیا۔ خواہ مخواہ خواب نظر آگیا۔ رات کو اچھا بھلا سویا تھا۔ نہ شیطان کے متعلق کچھ سوچا نہ کوئی ذکر ہوا۔ نہ جانے کیوں ساری رات شیطان سے باتیں ہوتی رہیں اور شیطان نے خود اپنا تعارف نہیں کرایا کہ خاکسار کو شیطان کہتے ہیں۔ یہ نقطہ ذہنی تصویر تھی۔ جس سے شبہ ہوا کہ یہ شیطان ہے۔ چھوٹے چھوٹے نوک دار کان، ذرا ذرا سے سینک، ڈبلا پتلا۔ بانس جیسا لمبا قد، ایک لمبی دم جس کی نوک تیر کی طرح تیز تھی۔ دم کا سرا شیطان کے ہاتھ میں تھا۔ میں ڈرنا ہی رہا کہ کہیں یہ چھپو نہ دے۔ نرالی بات یہ تھی کہ شیطان نے عینک لگا رکھی تھی۔ رات بھر ہم دونوں نہ جانے کس کس موضوع پر بحث کرتے رہے۔

اب صبح چائے کی میز پر بیٹھتے ہیں تو میری آنکھیں کھٹی کی کھٹی رہ گئیں۔ رات کی شکل بالکل شیطان سے ملتی تھی۔ شکل کیا حرکتیں بھی وہی تھیں۔ ویسا ہی قد وہی چھوٹا سا چہرہ، لمبی گردن، ویسی ہی عینک، وہی مکاری مسکراہٹ۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ چپکے سے رضیہ کے کان میں کہہ دیا کہ راتوں شیطان سے

ملتے ہیں۔ وہ بولی۔ آپ کو کیا پتہ؟ کہا کہ ابھی ابھی تو میں نے اصلی شیطان کو خواب میں دیکھا ہے۔ حکومت آپا رضیہ کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ اُنہوں نے جو ہیں سرگوشی کرتے دیکھا تو بس بے قابو ہو گئیں۔ ذرا پرچھا۔ کیا ہے؟ — رضیہ نے بتادیا۔ حکومت آپا کر تو ایسا مرقہ خدا سے۔ بس میز کے گرد جو بیٹھا تھا اُسے پتہ چل گیا کہ رونی کا نیا نام رکھا جا رہا ہے۔ لیکن محض خراب دیکھنے پر تو نام نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ ویسے رونی نے ہمیں تنگ بہت کر رکھا تھا۔ بچوں تک کی خواہش تھی کہ ان کا نام رکھا جائے۔

ہم چار ختم کرنے والے تھے۔ تجھے اپنے آلیٹ کا انتظار تھا اور رضیہ کو کافی کا۔ کالج میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا، اس لئے مزے مزے سے ناشتہ کر رہے تھے۔ اتنے میں ننھا حامد بھاگا بھاگا آیا۔ اس کے سکول کا وقت ہو گیا تھا۔ اسلئے جلدی میں تھا۔ رونی کے برابر بیٹھ گیا۔ حامد کو بھجوا دیا تھا۔ اس لئے اس کی حجامت ذرا باریک کر دانی گئی تھی۔ رونی نے بڑی لالچائی ہوئی نگاہوں سے حامد کے سر کو دیکھا۔ جو ننھی حامد نے ٹوسٹ کھا نا شروع کیا۔ رونی نے ایک ہلکا سا تھپتھپ حامد کے سر پر جمادیا اور میں نے فوراً رضیہ سے کہہ دیا کہ سچ مچ رونی شیطان ہی ہیں۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ اگر کوئی ننگے سر کھائے تو شیطان وصول مارتا ہے۔ حکومت آپا چونک کر ہماری جانب متوجہ ہوئیں۔ ان کو پتہ چلا تھا کہ سارے کنبے کو معلوم ہو گیا کہ آج سے رونی شیطان کہلائے جائیں گے یہ مفاہدہ قصہ جس کے بعد رونی شیطان مشہور ہو گئے۔ چند ہی دنوں میں ہر ایک کی زبان پر یہ نام چڑھ گیا۔ یہاں تک کہ خود رونی نے اس نام کو

بہت پسند کیا۔

رونی اور میں بچپن کے دوست تھے اور مجھے اُن کی سب کہانیاں یاد تھیں۔ جب ہم بالکل چھوٹے چھوٹے تھے تو ایک دن رونی کو اُن کی نانی جان تاریخ پڑھا رہی تھیں۔ جب پتھر اور دھات کے زمانے کا ذکر آیا تو رونی پوچھتے ہیں۔ ”نانی جان آپ پتھر۔ کس زمانے میں کتنی بڑی تھیں؟“ پھر کہیں سقراط اور بقراط کا ذکر ہوا۔ یہ بولے۔ ”نانی جان سقراط اور بقراط کیسے تھے؟“

”کیا مطلب؟“ انھوں نے پوچھا۔

”آپ نے تو دیکھے ہوں گے۔“ جواب ملا۔

ہر وقت رونی کو کچھ نہ کچھ سُوجھتی رہتی تھی۔ ہمارے سکول کے سامنے جو سڑک تھی، اُس پر بے شمار گھوڑے گزرتے تھے (مع سواروں کے) کوئی سوار مزے سے جا رہا ہے۔ ایک ایک رونی چلاتے۔ جناب! سُسنے ذرا۔ گھوڑے کی دُم گر گئی ہے۔ اُٹھا لیجئے۔ ورنہ گھوڑا لندورہ جائے گا۔ اور سوار فوراً چرک کر ٹھہر جاتا اور پیچھے مڑ کر دیکھتا، خاص طور پر گھوڑے کی دُم کو تو ضرور دیکھتا۔ ایک دن رونی کلاس میں طوطا لے آئے۔ پوچھا، یہ کیا، بولے ابھی پچھلے ہینے میں نے پڑھا ہے کہ طوطا سو سال تک زندہ رہتا ہے۔ میں نے سوچا، سُنی سنانی کا کیا اعتبار، خود تجربہ کر کے دیکھ لیتے ہیں۔

اُستاد صاحبان سے تو ہمیشہ نوک جھومک رہتی تھی۔ ایک روز ماسٹر صاحب نے چہل قدمی کے معنے پوچھے۔ کسی کو بھی نہ آئے۔ رونی اُٹھ کر بولے۔ ”دو مرتبہ بیس قدمی۔“ انھوں نے وضاحت چاہی۔ رونی

بولے۔ ”جناب! چہل کے معنی ہیں چالیس اور چالیس قدمی سے دو مرتبہ بیس قدمی کہیں تو بہتر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ٹہلتے ہوئے انسان آگے جاتا ہے اور پھر واپس آتا ہے۔“

جغرافیہ کے ماسٹر صاحب نے ایک دن ردنی سے پوچھا۔ ”اگر تم مشرق کی طرف منہ کر کھ دو، تو ہاتھ پھیلا دو، تو تہا رے بائیں ہاتھ پر کیا ہوگا؟“
ردنی نے بڑی مسہمی شکل بنا کر کہا۔ ”انگلیاں۔“

حساب میں تو بالکل پھسڈی تھی۔ سوال پوچھا جا رہا ہے ردیوں کے متعلق اور جواب نکلتا ہے مہینوں میں۔ اسی طرح مہینوں کا جواب سیروں چھانکوں میں نکل رہا ہے۔ حساب کے ماسٹر ڈانٹتے تو ردنی کہتے۔

”جناب میں کیا کروں، یہ کمبخت جواب اسی طرح آیا تھا۔“ اور جب مزدوری اور وقت کے سوال نکالتے تو جواب آتا ۵۳ لڑکے۔ یا ۵۳ ۱۹ عورتیں۔ اس پر ماسٹر صاحب بہت خفا ہوتے۔ ایک روز ردنی نے جواب نکالا ۲ عورت۔ ماسٹر صاحب چنگھ مار کر بولے۔ ”نالائق! ۲ عورت بھی کبھی دیکھی ہے آج تک؟“ یہ سُر کھجا کر بولے۔ ”جناب کوئی لڑکی ہوگی۔“

لیکن جب ہماری جماعت میں انسپکٹر صاحب معائنہ کرنے آئے تو وہ ردنی سے بہت خوش ہوئے اور انعام دے کر گئے۔ انہوں نے پوچھا۔ ”اگر پانی کو ٹھنڈا کیا جائے تو کیا بن جائے گا؟“ ہم نے سوچا کہ ردنی کہہ دیں گے۔ برف بن جائے گا۔

ردنی بولے۔ ”کتنا ٹھنڈا کیا جائے؟“

وہ بولے "بہت ٹھنڈا کیا جائے۔"
رونی سوچ کر بولے۔ "تو وہ بہت ٹھنڈا ہو جائے گا۔" (بہت پر
زور دے کر)

"اگر اور بھی ٹھنڈا کیا جائے؟"
"نو پھر وہ اور بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔" رونی بولے۔
"اور اگر اُسے بے حد ٹھنڈا کیا جائے؟"
"تو وہ بے حد ٹھنڈا ہو جائے گا۔"
انسپکٹر صاحب مسکرانے لگے، بولے۔ "اچھا اگر پانی کو گرم کیا جائے تب؟"
"تب وہ گرم ہو جائے گا۔"

"نہیں، اگر ہم اُسے بہت گرم کریں اور دیر تک گرم کرتے رہیں پھر؟"
رونی کچھ دیر سوچتے رہے، یکایک اُچھل کر بولے۔ "پھر۔ چاء بن
جائے گی۔" اور انسپکٹر صاحب نے ایک عظیم الشان قہقہہ لگایا۔ ماسٹر صاحبان
نے کوشش کی کہ انہیں کہیں ادھر ادھر لے جائیں لیکن وہ وہیں کھڑے ہے
اور رونی سے بولے۔ "بتی کی کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں؟"

"تقریباً چار!"

"اور آنکھیں؟"

"کم از کم دو۔"

"اور دُم؟"

"زیادہ سے زیادہ ایک!"

اور کان؟“ انھوں نے پوچھا۔

”تو کیا سچ مچ آپ نے اب تک بتی نہیں دیکھی؟“ رونی منہ بنا کر بولے اور انیسٹر صاحب ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔

— ان دنوں سے میں اور رونی دوست تھے۔

میں نج صاحب کے ہاں رہتا تھا۔ پہلے ہمارا کنبہ بھی وہیں تھا۔ پھر آبا کا تبادلہ ہو گیا اور وہ ایسی جگہ تبدیل ہو کر گئے، جہاں کالج تو ایک طرف کوئی سکول تک نہ تھا۔ نج صاحب نے ہوسٹل نہ جانے دیا۔ چنانچہ میں ان کے ہاں رہنے لگا۔ رونی بھی وہیں رہتے تھے اور نج صاحب سے ان کا کوئی دُور دراز کارشتہ تھا اور غالباً نج صاحب کے بھتیجے تھے۔ جہاں کنبے کے تمام افراد مجھے اچھے لگتے تھے وہاں ایک ہستی تو بہت عزیز تھی۔ وہ تھی رضیہ! اور جن سے میں ڈرتا تھا وہ تھیں رضیہ کی بڑی بہن، جن کا اصلی نام تو اچھا بھلا سا تھا۔ لیکن سب بچے انھیں حکومت آپا کہتے تھے میری ہی عمر کی ہوں گی، یا شاید کچھ بڑی ہوں۔ اگر وہ وہاں نہ ہوتیں تو میں اور رضیہ کبھی کے بڑے گھرے دوست بن گئے ہوتے لیکن انہیں میں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

سارا دن کالج میں گزرتا۔ شام کو کھیلنے چلا جاتا اور رات کو سینما۔ رضیہ سے باتیں کرنے کا وقت ہی نہ ملتا۔ ہفتے بھر میں ایک آدھ مرتبہ موقع ملتا۔ وہی حکومت آپا کی نذر ہو جاتا۔ بنتی تو اُن کی کسی سے بھی نہ تھی البتہ مجھ سے اور رونی سے خاص لگاؤ تھی۔ میں تو چپ ہو جاتا لیکن رونی ایسا جواب دیتے کہ حکومت آپا کھسیانی ہو کر رہ جاتیں۔

شکوفے

سارا دن لڑتی جھگڑتیں اور دوسروں پر خواہ مخواہ تنقید کرتی رہتیں۔ کسی بات کا شہر میں ڈھنڈورا پٹوانا ہو، جا کر حکومت آپا کو بتا دو، فوراً ہر ایک کو پستہ چل جائے گا۔

میں بالکل نہ سمجھ سکا کہ آخر ان کی پالیسی کیا ہے؟ ان کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ رونی کا نظریہ یہ تھا کہ یہ اپنا وقت بھی ضائع کر رہی ہیں اور دوسروں کا بھی، اور مجھے یہ نظریہ حرف بحرف صحیح معلوم ہوتا تھا۔

اُدھر میں اور رونی نہایت عزیز دوست تھے۔ میں ان سے کوئی بات نہیں چھیپاتا تھا۔ یہاں تک کہ رضیہ کے متعلق بھی سب کچھ انہیں بتا رکھا تھا اور جو باتیں رضیہ اور میں آپس میں کرتے وہ میں رونی سے فوراً کہہ دیتا اور ہمیشہ اُن کے مشوروں پر عمل کرتا۔ وہ بڑے خلوص سے مجھے بتاتے کہ آج رضیہ سے یہ کہنا، آج یہ پوچھ کر دیکھنا، آج یہ کرنا، آج وہ کرنا۔ اور میں اُسی طرح کرتا۔

غرضیکہ وہ میرے بے حد عزیز دوست تھے۔

ہمیں ایک صاحب نے سہ پہر کو کچر پر مدعو کیا۔ ان سے واقفیت ہوئی۔ وہ بھی کس طرح وہ ایک دن اپنے آبا کے ساتھ حج صاحب سے ملنے آئے، وہاں میں اور رونی بیٹھے تھے۔ اُن کے آبا رونی کی باتوں سے پھرٹک اُٹھے، بولے ”کیوں بر خوردار! آج کل کیا کرتے ہو؟“

یہ بولے ”جی آج کل بی، اے کا امتحان دیا کرتا ہوں۔“ اور حقیقت یہی تھی۔ رونی نے جانے کتنے سال سے بی، اے کا امتحان دے رہے تھے۔

پھر وہ بزرگ جج صاحب سے بولے۔ ”کیا بتاؤں کتنا جی چاہتا ہے کہ آپ کو فون کروں لیکن ہمیشہ بھول جاتا ہوں آج کل تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ پہلے پہل یادداشت کے طور پر ایک نوٹ بک میں ایسی باتیں لکھ لیا کرتا تھا لیکن اب وہ نوٹ بک ہی کہیں بھول جاتا ہوں۔“

رونی بولے۔ ”جی فون کا نمبر یاد کرنے کے طریقے میں نے ایک کتاب میں پڑھے ہیں۔ اجازت ہو تو عرض کروں؟“

وہ بولے۔ ”ضرور!“

رونی بولے۔ ”ہاں لکھا تھا کہ اول تو فقط ایسے حضرات سے راہ و رسم بڑھائی چاہیے جن کے فون نمبر بالکل آسان ہوں۔ مثلاً پانچ ہزار، دو ہزار یا چار سو بیس۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو نمبر کا بغور مطالعہ کرنا چاہئے۔ مثلاً ۶۴۵ کو یاد کرنا نہایت آسان ہے۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ اس میں پچپن جمع کر دیئے تو سات سو بن جائیں گے اور اگر سات سو میں تین سو اور جمع کر دیئے جائیں تو ہزار بن جائیں گے۔ اسی طرح اگر ۶۴۵ کو ۶۴۵ سے ضرب دیا جائے تو فقط ۴۱۶۰۲۵ بن جائے گا۔ اور اگر ہم یاد رکھیں کہ ۶۴۵ محض چھ روپے چار آنے اور پانچ پانی ہے تو اسے کبھی نہیں بھول سکتے۔“

وہ بزرگ بڑے غور سے سن رہے تھے۔

رونی بولے۔ ”اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر یہی بہتر ہوگا کہ تاریخ کی کتاب کھول لی جائے، اور اس نمبر کا سن تلاش کیا جائے۔ مثلاً ۶۴۵ء میں سے اگر چھ کا ہندسہ ہٹا دیں تو ۴۵ رہ جاتا ہے اور ۴۵ء قبل از مسیح میں سیزر

شگونی

کو ہمیشہ کے لئے ڈکٹیٹر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ادھر اگر اس میں ایک ہزار جمع کر دیں، تو ۱۶۴۵ء میں نیزنی کی لڑائی ہوئی تھی۔“

اس دن سے وہ بزرگ اور اُن کے صاحبزادے ہمارے دوست بن گئے۔ کچھ میں دیر تھی، میں رونی کے کمرے میں گیا۔ دیکھا کہ بیٹھے حامد کو پڑھا رہے ہیں۔ بولے بیگم کہ گئی ہیں کہ اسے پڑھانا۔ میں بھی پاس بیٹھ گیا۔ رونی بولے۔ ”کیوں ننھے، دُنیا میں کل کتنے اونٹ ہوں گے؟“ وہ چپ رہا اچھا!۔ کیا رومن لوگ گاجریں کھاتے تھے؟“

”پتہ نہیں!“

ایک سال میں کتنے اپنچ ہوتے ہیں؟“

ننھے نے حساب لگا کر کچھ عجب الٹا سیدھا سا جواب نکال دیا۔ اب رونی خنگی سے بولے۔ کیا تمہیں سچ پچ پتہ نہیں کہ رومن گاجریں کھاتے تھے یا نہیں؟“

”جی نہیں!“ ننھا ڈر کر بولا۔

”اور یہ بھی پتہ نہیں کہ دُنیا میں اونٹ کتنے ہیں؟“

”جی نہیں!“

”جہالت کی انتہا ہے۔ کیا تمہیں سچ پچ علم نہیں؟“ رونی زور سے بولے ”جی نہیں!“ ننھا سہم گیا۔

”مجھے خود پتہ نہیں۔“ رونی بولے اور ننھے کو چھٹی بٹ گئی۔

اتنے میں رونی کے نام ایک خط آیا، جسے پڑھ کر اُنہوں نے بہت بُرا منہ

شیطان

بنایا، ناک بھول چڑھائی۔ کچھ دیر ٹہلتے رہے، پھر بولے۔ ”کچھ اور بھی سناؤ۔“
چھوٹے بھائی صاحب نے مونچھیں رکھ لی ہیں۔ کس قدر منع کیا تھا اُسے، یہی
نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی اگالی ہے۔ ”! فوراً نوکر کو بلایا اور ایک تار لکھ
کر دیا کہ بھیج دے۔ میں نے تار کی عبارت پڑھی۔ لکھا تھا (SHAVE
(ATONCE) وہ تار اسی وقت بھیج دیا گیا۔

ہم کچر کے لئے تیار تو ہو گئے۔ لیکن ہمارے نئے دوست نہیں پہنچے تھے۔
رونی نے فون کرنا چاہا لیکن نمبر نہ ملا۔ آخر چڑ کر بولے۔ ”تو کسی اور کو فون کر دیں؟“
”کسی اور کو؟“

”ہاں! کیا حرج ہے؟ — کئے دیتے ہیں۔“ اُنھوں نے نہ جانے کون
سے نمبر کو بلایا۔ میں سرک کر ریسدر کے نزدیک ہو گیا۔

”کون صاحب بول رہے ہیں؟“ رونی بولے۔

”خاکسار ہے، عبد المجید مجبور۔!“

”اوہ! عبد المجید تر بوز؟ — تو گویا آپ شاعر بھی ہیں؟“ حالانکہ اُنھوں نے

صاف مجبور کہا تھا۔

جی نہیں، مجبور! — وہ بولے۔

صاف کیجئے، میں تو ایسی بے ادبی نہیں کر سکتا۔ آپ اس قدر کسریٰ

کر رہے ہیں یعنی عبد المجید لنگور۔!“

”افوہ! — مجبور — جج — بورہ —!“ وہ بولے۔

”اچھا! مجبور صاحب ہیں۔ آپ کل کتنے بھائی ہیں؟“

شکر نے

”چار ہیں ہم!“ وہ بولے۔

”اگر آپ پانچ ہوتے تو ہمارا کیا بگاڑ لیتے“ رونی بولے اور جلدی سے

ریسیور رکھ دیا۔

اتنے میں وہ صاحب آگئے اور ہم سینما روانہ ہوئے۔ پوچھا پوچھ کر کون سی ہے؟ بولے ”انصاف کی توپ“۔ میں نے صدائے احتجاج بلند کی کہ کرکٹ ڈیو جیسی دلچسپ چیزیں چھوڑ کر اس قسم کی کچر دیکھنا سراسر بزدلتی ہے۔ رونی بولے۔ چلو اب تیار ہو گئے ہیں تو خواہ مفلس عاشق ہو یا خوشنواں بیٹا ہی کیوں نہ ہو، ضرور دیکھیں گے۔“

راستے میں اُن صاحب نے اپنے والد بزرگوار کے متعلق جو باتیں شروع کی ہیں تو ہم تنگ آ گئے۔ اُن کی باتیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ اُن سے والد منصف تھے اور اچھے خاصے بھاری بھر کم انسان تھے۔ یہ اُن کی تعریفیں کر رہے تھے کہ کس طرح اُنھوں نے خطرناک عادی مجرموں کو بری کر دیا اور اچھے بھلے معصوم لوگوں کو قید خانے میں بھیج دیا تھا۔ (سکور تو برابر ہی رہا) اور اب سارے ملک میں اُن کے حیرت انگیز انصاف کا ڈنکا بج رہا تھا۔

آخر تنگ آ کر رونی بولے۔ ”تو وہ بہت اچھا انصاف کرتے ہیں؟“
”یقیناً“ جواب ملا۔

”یعنی نہایت ہی بلند پائے کا انصاف کرتے ہیں وہ؟“

”جی!“

”پھر تو وہ“ انصاف کی توپ۔“

کئی مرتبہ جی چاہا کہ حکومت آپا سے پوچھوں۔ آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟ ہم کیا کریں جو آپ کے اس عجیب و غریب غناب سے بچ سکیں، جو ہر وقت ہم پر نازل ہوتا ہے۔ جو بس گھنٹے ہاتھ دھو کر (بلکہ ہاتھ منہ دھو کر) میرے پیچھے پڑی رہتی تھیں۔ رضیہ کی طرف میں نے ذرا آنکھ اٹھائی اور آفت آگئی۔

اس میں میرا کیا تصور رہتا، گھر میں ایک اچھی لڑکی ہے جو اتنی پیاری لگتی ہے تو اُسے کیوں نہ دیکھیں۔ اگر یہی ہے تو حکومت آپا رضیہ کو کسی صندوق میں مقفل کیں نہیں کر دیتیں تاکہ کوئی نہ دیکھ سکے۔ جب دیکھو تنقید کر رہی ہیں۔ پہلے پہل تو میں اُداس ہو جایا کرتا۔ بعد میں میں عادی ہو گیا اور تنقید کیسی ہوتی۔ شوقین لڑکا ہے۔ رنگین مزاج ہے۔ رنگ برنگے کپڑے پہنتا ہے خوشبو کیوں لگاتا ہے۔ اس کا سینہ کافی چوڑا ہے لیکن چہرہ کچھ ڈبلا ہے۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں (نہ کیجئے اعتبار، کس مسخرے نے التجا کی ہے آپ سے) ہر وقت بازوؤں کے پٹوں کو ٹوٹا رہتا ہے (مضبوط پٹے ہیں کیوں نہ ٹوٹیں) بیزاری کو بزاری کہتا ہے (یہ آپ کے کانوں کا قصور ہے) ہر وقت اکڑ کر چلتا ہے (تو کیا بڑا ہو کر چلا کروں؟) رضیہ کے متعلق سوچتا رہتا ہے، اُسے گھورتا رہتا ہے! اُسی کی باتیں کرتا ہے (رضیہ اچھی جو لگتی ہے)۔ مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا (مجھے بھی آپ ذرا اچھی نہیں لگتی)۔

اور حکومت آپا کا مکمل کلام تھا یہ فقرہ — ”مجھے پہلے ہی پتہ تھا“ (لفظ ”پہلے“ پر خوب زور دے کر) ایک دن میں لاہری سے شہر مکہ رضیہ سلاط پر تاراجی کتاب لے آیا۔ حکومت آپا نے دیکھ لی بولیں ”مجھے پہلے ہی پتہ تھا“

شکوہ

ایک دن ایک ڈرامے میں لگاتار دو گھنٹے رضیہ کو دیکھتا رہا اور پارٹ غلط سلاط کر گیا۔ حکومت آپا دیکھ کر چلائی۔ ”مجھے پہلے ہی پتہ تھا“ اور رونی بولے۔ ”جب آپ کو ہمیشہ پہلے ہی سے پتہ ہوتا ہے تو آپ ہمیں پہلے سے ٹوک کیوں نہیں دیتیں۔“

رونی اکثر انہیں آرٹس ہاتھوں لیتے تھے۔ ایک روز بیگم کا کوئی قیمتی زیور کھو گیا۔ ہم سب ڈھونڈ رہے تھے۔ یکایک رونی بولے۔ ”حکومت آپا تمہیں تو پتہ ہوگا کہ زیور کہاں ہے۔“

”مجھے کیا پتہ؟“ وہ بولیں۔

”تمہیں پہلے ہی سے پتہ ہوا کرتا ہے۔“

پھر ایک دن سب پریشان بیٹھے تھے۔ کوئی کہتا تھا حامد پاس ہو گیا، کوئی کہتا تھا بالکل فیل ہے۔ ٹیلی فون کیا کوئی جواب نہ آیا۔ جج صاحب بھی پورا زور لگا چکے تھے۔ رونی بولے۔ ”لو حکومت بتا ہی دو۔“

سب حکومت آپا کے پیچھے پڑ گئے کہ بتاؤ کون سی خبر صحیح ہے۔

رونی بولے۔ ”خواتین و حضرات! ایسے موقعوں پر آپ ہمیشہ حکومت سے

مشورہ لیا کیجئے۔ یہ ولی اللہ ہیں اور انہیں ہر چیز کا پہلے سے پتہ ہوتا ہے۔“

اس کے باوجود حکومت آپا کا تکیہ کلام اسی طرح رہا۔

رونی مجھے رضیہ کے متعلق طرح طرح کے مشورے تو دیا کرتے لیکن

ہمیشہ پریشان رکھتے تھے۔ سب سے پہلے تو یہ سوال پوچھتے کہ آخر یہ پاس

کیا ثبوت ہے کہ رضیہ کو میں اچھا لگتا ہوں۔ یقیناً کوئی ثبوت نہ تھا۔ اس

لیے یہ قہر کا رزق قرار دی جاتی تھی۔ کسی کو پسند کرنے سے کچھ نہیں بنتا۔ جب تک وہ بھی پسند نہ کرے، لہذا ان کے فارمولے کے مطابق میں اور رضیہ بالکل اجنبی تھے۔

وہ ہمیشہ یہی کہتے کہ دُنیا بہت بڑی ہے، کہیں اور جا کے کوشش کرو، رضیہ سے بھی بہتر لڑکیاں ملیں گی۔ اور مجھے اُن کا یہ مشورہ بالکل پسند نہ آتا۔ ایک روز بولے۔ ”رضیہ کی نظر کمزور ہے، اُسے دُور کی چیزیں دُھندلی دکھائی دیتی ہیں۔“

”تمہیں کیا پتہ؟“

”عید کا چاند اُسے نظر نہ آسکا۔ چنانچہ اُس نے حج صاحب کی عینک سے دیکھا تھا۔“

”تو پھر؟“

”پھر کیا؟ شادی تک تو وہ کیا عینک لگائے گی، البتہ شادی کے بعد فوراً لگالے گی۔“

اُسی روز شام کو رونی اور حکومت آپا کی بحث ہو گئی۔ موضوع تھا۔ ”عینک۔“ نہ جانے کون عینک کے خلاف بول رہا تھا اور کون طرف دار تھا۔ غدر مچا ہوا تھا۔

میں کچھ دیر باہر سُنتا رہا۔ پھر اندر چلا گیا۔

رونی بولے۔ ”تو گویا خاکسار جیت ہی گیا۔“

حکومت آپا بولیں۔ ”تعجب ہے کہ تین گھنٹے کی بحث کے بعد بھی آپ

قابل نہیں ہوئے۔

تین گھنٹے کی بحث کے بعد: میں نے پوچھا
 ”ماں بھی تین گھنٹے تک بحث ہوئی، یونے نین گھنٹے حکومت بولیں۔
 دس منٹ وقفہ رہا اور پانچ منٹ میں بولا۔“

اور وہ حل ہی تو نہیں کیونکہ وہ بولتی بہت بھتیں۔
 اتنے میں ٹن ٹن کرتا ہوا آگ بجھانے کا انجن سڑک سے گزرا۔
 حکومت آپا بولیں۔ کہیں آگ لگی ہے شاید اس طرف۔!“
 اتنے میں دوسرا انجن دوسری جانب ٹن ٹن کرتا ہوا چلا گیا۔ حکومت آپا
 بولیں۔ ”اوہ! ادھر بھی آگ لگی ہے۔!“
 ”رونی سرٹکا کر بولے۔ ”دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔“ اور
 وہ ناراض ہو کر چلی گئیں۔

رونی خوش ہو کر بولے۔ ”امرو دکھائے جائیں؟“ میں نے سر
 ہلادیا۔ کہنے لگے۔ ”کوئی نوکر آئے تو اسے باغ میں بھیجتے ہیں۔“ اتنے میں
 جتن (دیو) گزرا۔ یہ جتن صاحب ایک نہایت ہی موٹے نوکر تھے، جنہیں بچے
 رات کو دیکھ کر ڈرتے۔ اس لئے اُن کی ڈیوٹی دن کو لگا رکھی تھی، رات کو اُن
 کی چھٹی ہوتی۔

رونی نے آواز دی۔ ”مجن!“ اُس نے سنا ہی نہیں۔ رونی نے پھر
 آواز دی۔ اُس نے پھر نہیں سنا۔ رونی بولے۔ ”انگوٹھی گھسیں اس کے
 لئے؟“ میں نہ سمجھ سکا۔

رونی نے سمجھایا۔ ”بھئی دیو ہے ایسے ویسے تھوڑا ہی آجائے گا۔ کم از کم انگوٹھی تو گھسی پڑے گی۔“

ذرا سی دیر میں جتن پھر گزرا۔ ہم نے بلایا، وہ آگیا۔ رونی بولے۔ ”ہم نے انگوٹھی گھسی تھی۔ تم آئے ہی نہیں۔“ ویسے وہ بڑا خوش مزاج تھا لیکن اس وقت نہایت اداس دکھائی دے رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کے گھر سے تار آیا ہے۔ اسے فوراً بلایا گیا ہے۔

”گھر سے اول تو میں خود واپس آجاؤں گا، ورنہ آپ بلالیں۔“ وہ بولا۔
 ”ہاں ہاں، ضرور بلالیں گے۔“ میں نے یقین دلایا۔

”بھلا آپ کس پتے پر اطلاع دیں گے؟ کیونکہ میں نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھروں گا۔“

رونی بولے۔ ”جب اس کا تریہی علاج ہے کہ تم اپنی مونچھ کا ایک بال ہمیں دے جاؤ۔ تاکہ جب ہم تمہیں بلانا چاہیں تو بال کو دھوپ میں رکھ دیں گے۔ پہلے آندھی آئے گی۔ پھر مینہ اور بعد میں تم اڑتے آ جاؤ گے۔“
 وہ کھکھلا کر ہنس پڑا۔ میں نے لاحول پڑھی۔

جتن گیا تو دیکھا کہ رونی کمرے میں نہیں تھے۔ دوسرے روز پھر اسی طرح کا واقعہ ہوا۔ مجھے کچھ شبہ سا ہو گیا۔ میں نے رضیہ سے کہا۔ اور ایک پروگرام بنایا گیا۔ سہ پہر کو چار پر رضیہ نے جان بوجھ کر لاحول پڑھ دی اور بجلی کی طرح رونی کمرے سے نکل گئے۔ حالانکہ ابھی چار شروع بھی نہ ہوئی تھی۔ لہذا میں نے سب کو بتا دیا کہ چونکہ رونی لاحول سے بھاگتے ہیں اور ان کا علیہ بھی شیطان سے

شکوہ

ماتا ہے۔ اس لئے آج سے وہ مکمل شیطان ہیں۔ آئندہ کوئی انہیں رونی نہ کہے، شیطان کہے۔ یعنی اگر سامنے ہمت نہ پڑے تو کم از کم پیٹ پیچھے ہی کہہ دے۔ بس اُس دن رونی شیطان فرار دینے لگے۔

نہایت دلفریب چاندنی رات تھی، پورا چاند درختوں کے جھنڈے سے طلوع ہوا تھا۔ ہوا کے خشک جھونکوں سے پودے جھوم رہے تھے۔ میں فوارے کے پاس بیٹھا تھا۔ خیالات کے سلسلے کو جہاں کہیں سے بھی شروع کرتا تھا، ختم رضیہ پر ہوتا تھا۔ یکایک جو دیکھتا ہوں، تو رضیہ پلاٹ میں بیٹھی چاند کو تک رہی تھی۔ ان دنوں اکثر میں اُسے تنہا گوشوں میں خاموش بیٹھے دیکھا کرتا تھا۔ آخر کس کے متعلق سوچا کرتی ہے یہ؟ میں بے چین ہو گیا۔ مجھ سے رٹا نہ گیا اور پہنچا سیدھا شیطان کے کمرے میں، وہ سو رہے تھے۔ انہیں زبردستی جگایا۔

”ارے!“ میرے مُنہ سے نکل گیا۔ ”تم عینک لگا کر سوتے ہو؟“
”کل عینک لگانی بھول گیا تھا۔ رات بھر خواب دُھندلے نظر آئے۔ میں چاہتا ہوں کہ کم از کم خواب صاف دکھائی دیں۔“

میں اتنا بے چین تھا کہ مجھ سے ہنسا بھی نہ گیا۔ جلدی سے سب کچھ انہیں بتا دیا اور کہا۔ ”رضیہ کو کسی کا خیال ضرور ہے لیکن یہ پتہ نہیں کہ وہ خوش قسمت ہے کون؟ ویسے وہ آج کل ہر وقت کسی کے متعلق سوچتی ضرور رہتی ہے۔“
دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ مصیبت یہ تھی کہ کیسے یہ گھمتی سلجھائی جائے، ویسے میں یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ اُسے میرا کس قدر خیال ہے۔

آخر بڑی سوچ بچار کے بعد شیطان بولے۔ "بھئی اس کے لئے تو تھوڑی سی جرات کرنی پڑے گی۔"

"وہ کیا؟"

"اگر میری مانو تو تم خودکشی کر لو۔"

"خودکشی کر لوں؟" میں چونک پڑا۔

"اصلی نہیں نقلی خودکشی۔ ظاہر یہی کریں گے کہ تم سچ مچ خودکشی ہو گئے ہو، پھر دیکھیں رنئیہ کیا کرتی ہے؟"

میں نے صاف انکار کر دیا۔ بیگم کو ضرور پتہ چل جائے گا اور اگر انھوں نے امی کو لکھ دیا تو آفت آجائے گی اور خودکشی کرنا ہے بھی فضول سی حرکت۔

شیطان بولے۔ "بیگم کو تو ہرگز پتہ نہ چلنے دیں گے، اس اذکار کو سارا کنبہ ایک پارٹی پر جا رہا ہے۔ رنئیہ کا امتحان اگلے مہینے ہے اس لیے وہ یہیں رہے گی۔ بس میدان صاف پا کر تم خودکشی کر لینا۔ سارا انتظام میں کر دوں گا۔" ایک طویل بحث کے بعد شیطان نے مجھے ورغلا لیا۔ اگلے روز ہم نے خوب ریہرسل کئے۔

اتوار کا دن آیا۔ رنئیہ کے سوا سب پارٹی پر چلے گئے۔ مجھے اور شیطان کو بہت برا مجبور کیا گیا لیکن ہم نے ایک کرکٹ میچ کا بہانہ کر دیا۔

شیطان کی ہدایات کے مطابق تیار یاں کی گیندیں اور پھر میں نے خودکشی کر لی۔ ایک صوفے پر لیٹ گیا۔ ایک ہاتھ نیچے لٹک رہا تھا اور فرش پر سین اٹکھیلوں نے نیچے ایک خالی شیشی پڑی تھی۔ جس پر "زہر" لکھا تھا۔

شکر نے

شیطان نے میری طرف دیکھا۔ پوچھا۔ "تیار ہو" میں نے کہا "ہاں" اور انہوں نے ایک عجیب بے ڈھنگی آواز میں شور مچانا شروع کر دیا جس پر مجھے ہنسی آگئی۔ رضیہ بھاگی بھاگی آئی۔ میں نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن پلکوں میں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ شیطان نے فوراً اُسے بنایا کہ میں نے خود کشی کر لی ہے۔ رضیہ نے پہلے شیشی کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر میری نبض دیکھی بھلا میں نبض کس طرح بند کر سکتا تھا۔ بولی۔ "افو! ابھی تھوڑی سی جان باقی ہے۔" گہرائی ہوئی سامنے کے کمرے میں گئی۔ اُس کی آواز صاف سُنی دے رہی تھی۔ اس کے ہجے میں گھبراہٹ تھی۔ وہ ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کر رہی تھی۔ انھیں فوراً آنے کے لئے کہا۔ بولی۔ "خدا کے لئے جلدی کیجئے، زندگی اور موت کا سوال ہے" اور میرا دل مسرت سے لبریز ہو گیا۔ کس کی زندگی اور موت کا سوال ہے؟ میری زندگی کا یا رضیہ کی زندگی کا؟ میں نے شیطان کو اشارہ کیا وہ مسکرائے۔ رضیہ گہرائی ہوئی آئی اور میرا سر دبائے لگی۔ اب جو اس کی انگلیاں گردن تک پہنچی ہیں تو مجھے سخت گدگدی ہوئی۔ بے حد ضبط کیا۔ آخر کھکھلا کر ہنس پڑا اور جلدی سے بیٹھ گیا۔

"ہیں؟" رضیہ کے منہ سے نکلا۔

"ہیں؟" شیطان نے چنگھاڑ کر کہا۔

"دیکھا ڈرا دیا نا تمہیں؟" میں بولا۔

"واقعی میں تو ڈر رہی گئی تھی۔" اُس نے کہا اور خوشی کے مارے میرا

بُرا حال ہو گیا۔

تو گویا رضیہ کو میرا بہت خیال تھا۔ اُس نے خود جو کہا تھا کہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔

”تو کیا تم سچ سچ مجھ بہت گھبرا گئی تھیں؟“ میں نے تجاہلِ عارفانہ سے پوچھا۔
 ”ہاں کچھ گھبرا ہی گئی تھی۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔

”کچھ کیا؟۔۔۔ یوں کہو کہ مکمل طور پر گھبرا گئی تھیں، بہت بُری طرح گھبرا گئی تھیں۔“

”خیر! اتنی تو نہیں گھبرا ئی۔ دراصل خود کشی اچھی طرح نہیں کی گئی۔ اس میں کچھ خامیاں رہ گئیں۔“

”اب خواہ تم کچھ ہی کہو۔ ایک مرتبہ تو نہایت پریشان ہو گئی تھیں۔“
 ”مثلاً اس زہر کی شیشی کو لیجئے۔“ وہ بولی۔ ”مانا کہ اس میں کبھی ٹنکچر آئیوڈین آئی تھی لیکن پورے دو سال سے اس میں بادام روغن تھا اور اگر واقعی بادام روغن سے خود کشی ہو سکتی ہے، تب بھی یہ عرصے سے خالی پڑی تھی۔“

”لیکن تم نے فون تو بڑی گھبراہٹ میں کیا تھا۔“ میں کھسیانا ہو چلا تھا۔

”اچھا بتائیے فون کس کمرے میں ہے؟“

”ڈرائنگ روم میں!“ میں نے کہا۔

”اور میں نے فون کس کمرے سے کیا تھا؟۔۔۔ ساتھ کے کمرے سے نا؟“

”ہاں!“

”اور ساتھ کا کمرہ ہے گودام۔ اب بتائیے یہاں ٹیلیفون کہاں سے آگیا؟“

— اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں رضیہ کو بالکل اچھا نہیں لگتا، بلکہ شدید بُرا

ہی لگتا ہوں۔

اگلے روز ہم سب ایک رفاص کا ناچ دیکھنے گئے، بڑا مشہور رفاص تھا۔ بے شمار لوگ آئے تھے۔ شروع میں کچھ گانا بجانا ہوا۔ پھر اُس کا ناچ شروع ہوا۔ آرکسٹرا بجنے لگا۔ پہلے تو دیر تک وہ چپ کھڑا رہا۔ پھر اُس نے یکلخت ہوا میں ایک چھلانگ لگائی اور عجیب سی حرکتیں شروع کر دیں۔

”نہی حیران ہو کر بولی۔“ ”بھیا یہ پتھر کا بت اب تو خوب ہل رہا ہے۔“ اب جو اس اللہ کے بندے نے ہاتھ پیر مارنے شروع کئے ہیں تو نہی گہرا گئی۔ بولی۔“ ”بھیا یہ آدمی کیا کر رہا ہے؟“

حکومت آپا بولیں۔“ ”ناچ رہا ہے۔“

نہی بولی۔“ اس طرح ناچا کرتے ہیں کیا؟“

حکومت آپا بولیں۔“ ”چپ چاپ دیکھتی رہو، اسے کلاسیکل ناچ کہتے ہیں۔“

نہی غل گئی۔“ ”نہیں تو! یہ آدمی تو کچھ اور تماشا کر رہا ہے۔“

شیطان بولے۔“ ”نہی، بات دراصل یہ ہے کہ اُس نے علی الصبح گردش

سالت پایا تھا اور اب اُسے ”گردش فیلنگ“ ہو رہی ہے۔“

شیطان نے سرخ چھینٹ کا انگرکھا پہن رکھا تھا۔ سب لوگ انہیں

دیکھ رہے تھے۔ انٹرول ہوا۔ میں اور شیطان باہر آ گئے۔ چھینٹ کا انگرکھا

واقعی عجیب سی چیز تھی جو دیکھتا تھا، بھڑ جاتا تھا۔ چند حضرات نے تو پس چم

ہنسنا شروع کر دیا۔ شیطان رک گئے اور پیچھے مڑ کر بولے۔ ”حضرات آپ

کی ہنسی سرائیوں پر۔ لیکن آپ براہ کرم جلدی سے ہنس لیجئے کیونکہ مجھے ایک ضرور کام ہے اور بغیر آپ کے شوق کی تکمیل کے میں یہاں سے نہیں جاسکتا۔ وہ شرا سے گئے۔

”تو آپ ہنس چکے کیا؟“ شیطان نے پوچھا۔ وہ چپ رہے۔

”کیا بندہ جاسکتا ہے؟“ ان میں سے ایک نے سر ہلادیا۔

ہم جب واپس آئے تو ابھی اچھا خاصا دن باقی تھا۔ باغ سے گزرتے ہوئے شیطان رک گئے، مالی کو بلایا اور مٹی کا ایک ڈھیر دکھا کر بولے۔ یہ ڈھیر یہاں نہیں ہونا چاہئے۔

”جناب یہ بغیر کئی مزدوروں کے باہر نہیں پھینکا جاسکتا۔“

”واہ! معمولی سا کام ہے۔ ایک بڑا سا کھڑا کھودلو اور اس میں یہ مٹی

دبا دو۔“

بات مالی کی سمجھ میں آگئی اور وہ کام میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھر ہمارے پاس آیا اور بولا۔ ”جناب وہ مٹی تو بھر دی گئی۔ لیکن جو نئے گڑھے کی مٹی ہے اس کا کیا کیا جائے؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ ایک اور گڑھا کھود کر اس میں داب دو۔“

شیطان نے کہا۔ مالی پھر چلا گیا، کچھ دیر کے بعد واپس آیا اور بولا۔ ”وہ مٹی

تو دبا دی گئی، لیکن اب نئے گڑھے کی مٹی! — وہ کہاں پھینکی جائے؟“

”ہمیں نہیں پتہ۔“ شیطان جھلا کر بولے۔ ”معمولی سی بات ہے، ایک اور

گڑھا کھود لو۔ اور مالی بیچارہ سر کھٹاتا ہوا چلا گیا۔ اتنے میں جج صاحب تشریف

لے آئے اور وہیں بیٹھ گئے۔ ہم کیلوں کے متعلق باتیں کرنے لگے۔

”تمہیں کون سے کھیل پسند ہیں؟“ نج صاحب نے پوچھا۔

”کبڈی اور پولو“ شیطان نے جواب دیا۔

”کوئی خاص اچھے کھیل تو نہیں ہیں۔“ وہ بولے۔

”آپ کو کونسا کھیل مرغوب ہے۔“ شیطان نے پوچھا۔

”اُسے کھیل تو نہیں کہا جاسکتا۔ مجھے گھڑ دوڑ بہت پسند ہے۔ جب میں

یورپ میں تھا تو نہایت شوق سے گھڑ دوڑ دیکھا کرتا تھا۔“

”معاف کیجئے مجھے گھڑ دوڑ بالکل پسند نہیں۔“ شیطان بولے۔

”وہ کیوں؟“

”دیکھئے نا، یہ سب جانتے ہیں کہ کچھ گھوڑے کچھ گھوڑوں سے تیز دوڑتے ہیں

اور یہ بھی لازمی امر ہے کہ اگر بہت سے گھوڑے دوڑیں گے تو کچھ آگے نکل جائیں گے

اور کچھ پیچھے رہ جائیں گے اور آخر میں یہ ایک گھوڑا سب سے آگے نکل جائے گا۔

مجھلایہ معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ کون سا گھوڑا آگے نکلتا ہے، یا تو یہ ہو کوئی

گھوڑا اپنا دوست ہو تو اُسے دیکھتے آدمی چلا بھی جائے، ورنہ سب گھوڑے ایک

سے ہیں۔“ نج صاحب سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر

مُسکرا کر بولے۔ لاحول ولاقوة۔

اور دفعتاً شیطان کمرے سے نکل گئے۔

مجھے اور شیطان کو ایک بہت بڑی دعوت پر بلایا، بڑے مدبر قسم کے لوگ

شیطان

آئے ہوئے تھے۔ جج صاحب اور بیگم صاحبہ نہ جاسکے۔ چنانچہ ہمیں پوری آزادی مل گئی اور شیطان اُتر آئے اُلٹی سیدھی حرکتوں پر۔ ایک خطرناک سے بزرگ ہمای طرف بہت بُری طرح دیکھ رہے تھے۔ کچھ مولینا سے معلوم ہوتے تھے۔ نہ جانے کیوں اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں گھور رہے تھے۔ آخر جب اُن سے نہ رہا گیا تو شیطان سے بولے۔ ”صاحبزادے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم پورے آدھ گھنٹہ سے اُن لڑکیوں کو گھور رہے ہو، یہ نہایت بُری بات ہے۔“

شیطان بولے۔ ”قبلہ! گھورنا دو قسم کا ہوتا ہے۔ گھورنا بالتحقیق اور گھورنا بالتفریح۔ یہ خاکسار اس وقت اول الذکر کر رہا ہے۔ کیونکہ مجھے ابھی کسی نے بتایا ہے کہ اُن خاتون کی ناک نہ چھپی ہے اور ایک آنکھ بڑی ہے ایک چھوٹی۔“ مولانا ابھی کچھ کہنے ہی لگے تھے کہ شیطان جلدی سے بولے۔ ”اور آپ اُن کو کیوں نہیں منع کرتے ہو جو گھورنا بالتفریح کے مرتکب ہو رہے ہیں اور ایسے یہاں بیشمار حضرات ہیں۔ مثال کے طور پر اُن صاحب کو (اشارہ کر کے) ہی لیجئے جو زیر موچھ مسکرا رہے ہیں۔“

”زیر موچھ مسکرا رہے ہیں؟“

”لوگ زیر لب مسکرایا کرتے ہیں، لیکن اُن کی مونچھیں اس قدر گھنی اور خوشوار ہیں کہ ہم اس سکراہٹ کو محض زیر موچھ مسکراہٹ ہی کہہ سکتے ہیں۔ غالباً ان صاحب کاغزہ یہ ہو گا کہ۔“ ”مونچھوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں“ بات شروع کہاں سے ہوئی تھی اور جا پہنچی کہاں۔ مولینا کھسیانے ہو کر

بولے۔

شگرفے

”خیر! کچھ بھی ہو، بہر حال انسان کو پرہیزگار ہونا چاہئے۔“
”میں پرہیزگار ہوں۔“ شیطان بولے۔

”تم اور پرہیزگار؟ — نفوذ باللہ!“

”جی نہیں الحمد للہ مجھے فخر ہے کہ ماشاء اللہ میں پرہیزگار ہوں اور انشاء اللہ ہمیشہ رہوں گا۔ پرہیزگار وہ شخص ہے جو گڑبگڑائی، چکنی اور گرم چیزوں سے پرہیز کرے اور وہ میں کرتا ہوں۔“

اتنے میں پسند ہمان آگئے اور ہمارا تدارف ان سے کرایا گیا۔ وہ مولانا ادھر ادھر ہو گئے۔ جہاں چاروں طرف شور و غل مچا ہوا تھا۔ وہاں ایک صاحب کو دیکھا جو ٹپ چاپ بیٹھے تھے جیسے مراقبہ میں ہوں۔ شیطان نے اُن سے باتیں شروع کر دیں۔

”جناب اگر آپ بُرا نہ مائیں تو ایک بات پوچھوں؟“

”فرمائیے!“

”آپ چپ کیوں ہیں؟“

”بس یونہی!“

”تو صاحب اگر آپ عقلمند ہیں تو بے وقوفی کر رہے ہیں اور اگر بیوقوف ہیں تو عقلمندی کر رہے ہیں۔“ اور وہ صاحب سوچنے بیٹھ گئے کہ اس کا مطلب کیا ہوا۔

ادھر ادھر ڈھونڈنے پر وہ مولینا ہیں پھر مل گئے اور بدستور بڑے غیض و غضب سے ہیں گھورنے لگے۔ شیطان چاہتے تھے کہ اُن سے باتیں ہوں۔ لیکن کوئی بہانہ نہیں ملتا تھا۔ اتنے میں چند چھوٹے قد کی خواتین داخل

شیطان

ہوئیں۔ بالکل چھوٹی چھوٹی تھیں — شیطان جلدی سے بولے۔ ”دیکھئے قبلہ!
یہ پینگوئن سیریز (PENGUIN SERIES) کی خواتین ہیں۔

اور انھوں نے نہایت خطرناک انداز سے ہوں کی۔

اسی وقت ایک نہایت ہی ڈبلے صاحب ایک بہت زیادہ موٹے صاحب
کے ساتھ داخل ہوئے۔ دونوں میں اس قدر فرق تھا کہ ایک دوسرے کو بُری طرح
نمایاں کر رہے تھے۔

شیطان بزرگ کے قریب سرک کر بولے۔ ”وہ دیکھئے جناب‘ ان میں سے
ایک استعمال سے پہلے ہیں اور دوسرے استعمال کے بعد۔“ وہ شاید سمجھ
نہ سکے۔

شیطان بولے۔ ”آپ نے مقوی دواؤں کے اشتہار تو دیکھے ہوں گے،
وہاں استعمال سے پہلے اور استعمال کے بعد کے فوٹو بھی ملاحظہ فرمائے ہوں گے،
وہی چیز آپ یہاں دیکھ لیجئے۔“

دروازہ کھلا اور ایک نہایت ہی چھوٹے قد کے حضرت اور ایک بہت ہی
لبے حضرت داخل ہوئے۔ اُن کے قد میں کوئی چار پانچ فٹ کا فرق ہوگا۔
مولینا جھٹک کر بولے۔ ”ان پر تم نے کچھ نہیں کہا، کہہ دو ان کے متعلق
بھی۔!“

شیطان بولے۔ ”اجی کیا خاک کہوں، صاف تو ہے کہ گلی ڈنڈا آ رہا ہے۔“
اور اتنے میں کھانا شروع ہو گیا۔

ہم دونوں جان بوجھ کر اُن صاحب کے پاس بیٹھے، شاید انھیں مچھلی بہت
مرغوب تھی۔ چنانچہ کئی مرتبہ مچھلی منگوائی، اب جو وہ نیپلی منگواتے ہیں تو لازم اُدھر
۲۳۶

تسکوفے

اُدھر کی چیزیں تو دے جاتا لیکن مچھلی نہ لاتا۔ صاف ظاہر تھا کہ ختم ہو گئی ہے لیکن اُن کا اصرار یہی تھا کہ مچھلی لاؤ۔ بیچارہ ملازم صاف جواب بھی نہیں دے سکتا تھا اور ہاں بھی کہہ جاتا۔ آخر ان سے نہ رہا گیا بولے۔ ”یہ کمبخت مچھلی کیوں نہیں لاتا“ اور اب تو غائب ہی ہو گیا ہے، نہ جانے کہاں؟“

”مچھلیاں پکڑنے گیا ہے۔!“ شیطان بولے۔

باہر زور کی بارش شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ کھانے کے بعد یہ طے ہوا کہ بارش ختم ہونے کا انتظار کیا جائے اور اتنی دیر کافی کا دوسرا دور چلے۔

سب لوگ خاموش ہو گئے اور ایک بزرگ نے (جو فوراً ہی صدر بنائے گئے تھے) ایک صاحب سے کہا۔ ”آپ اپنی زندگی کا کوئی سچا واقعہ سنائیے۔“ انہوں نے سنا دیا۔ ساقوں نمبر شیطان کا آیا۔ چونکہ پہلے نہایت ہی دردناک کہانیاں سنائی گئی تھیں۔ اس لئے لوگ سہمے بیٹھے تھے۔ شیطان بولے۔ ”خواتین ۷۷“ یہ واقعہ میری زندگی میں سنگ میل کا کام دیتا ہے، اس نے میری زندگی ۷۸ سے زیادہ اثر ڈالا۔“ اور سب چپ ہو کر بڑی توجہ سے سننے لگے۔

”یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب میں گنگا کھیلا کرتا تھا۔ ویسے اب بھی اپنے کالج کا بہترین گنگا باز ہوں۔ لیکن اُن دنوں خرب مہارت تھی۔ ایک دن ہم سب کالج کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ہم منتظر تھے کب بارش ختم ہو اور باہر نکلیں، اتنے میں ہم نے دیکھا کہ ایک جگنو اڑا جا رہا ہے۔!“

”دن میں جگنو؟“ وہی مولینا بولے۔

”جی ہاں۔۔۔ یا پھر جگنو کی قسم کا کوئی اور پرندہ ہوگا۔“

”جنگلو پرندہ ہے کیا؟“ مولیٰ نے پوچھا۔

”اجی قبلہ! جو چیز اڑتی ہے وہ پرندہ ہے، ہاں تو سب لڑکوں کا جی لپیٹا کہ اسے پکڑیں۔ مگر بارش کی وجہ سے کسی کی ہمت نہ پڑی۔ آخر میں تیار ہوا۔ لڑکوں نے منع کیا کہ بھیگ جاؤ۔ گے۔ میں نے ایک نہ سنی اور باہر نکل آیا۔ گتکے کا ماہر تھا۔ ایک بوند آئی اسے گردن کی ایک جنبش سے بچا گیا۔ دوسری آئی اُسے ایک طرف ہٹ کے بچایا۔ تیسری آئی۔ اسے کمر کی جنبش سے بچایا، غرضیکہ اسی طرح بل کھاتا طرح طرح کے پینترے بدلتا ہوا ایسی موسلا دھار بارش میں جنگلو کو صاف پکڑ لایا اور جب واپس برآمدے میں پہنچا تو میرے لباس پر ایک بوند بھی نہ بچی۔“

اب جو قہقہے لگے ہیں تو فضا کی سنجیدگی یکلخت ختم ہو گئی۔ صدر صاحب اٹھ کر بولے — ”صاحب! ہم آپ سے ایک سنجیدہ واقعہ سننا چاہتے ہیں اور آپ کو دس منٹ دیتے ہیں۔ اتنے میں رنجواری صاحب ایک واقعہ سنائیں گے۔“

اتفاق سے یہ وہی صاحب تھے جو اتنی دیر سے گم سم بیٹھے تھے، بچاے گئے، سوچا کہ یہ کیا آفت آئی۔ بہتیرا بیچھا چھڑانا چاہا لیکن وہاں کون سننا تھا۔ آخر تنگ آکر بولے۔ ”مجھے کوئی نیا واقعہ تو یاد نہیں فقط ایک یاد ہے جو میں نے دوسری جماعت میں پڑھا تھا۔ وہ یہ کہ ایک جگہ چار بے وقوف بیٹھے تھے۔ ایک بولا کہ اگر دریا میں آگ لگ جائے تو مچھلیاں کدھر جائیں۔ دوسرا بولا، درختوں پر چڑھ جائیں۔ تیسرے نے فوراً —

”اجی حضرت وہ تو تین تھے، یہ چوتھا بے وقوف آپ کہاں سے لے آئے؟“

ایک طرف سے آواز آئی۔

”سگرفے“

”چرتے یہ خود تھے۔!“ شیطان بولے اور لوگ چیخیں مار مار کر ہنسنے لگے۔

اب صدر صاحب نے شیطان سے کہا کہ وہ ایک سنجیدہ واقعہ سنائیں۔

شیطان بولے۔ ”آج سے چند سال پہلے کا ذکر ہے۔ یہی کمرہ تھا۔ میں یہاں ڈاکٹر صاحب (میزبان کے صاحبزادے) کے ساتھ آیا تھا۔ کوئی رات کے دس بجے تھے۔ بالکل ایسی ہی بارش ہو رہی تھی۔ میں گھر نہ جاسکا اور اسی کمرے میں سونا پڑا (اشارہ کر کے)۔ میرا بستر یہاں بچھا ہوا تھا۔ میں لیٹ گیا۔ سگریٹ ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اسے بے خبری کے عالم میں ایک طرف پھینک دیا۔ پھر اچانک خیال آیا کہ نیچے قالین بچھا ہوا ہے۔ جلتا سگریٹ پھینکا تھا۔ جھانک کر جو دیکھتا ہوں تو پلنگ کے نیچے سے ایک سوکھا ہوا ہاتھ نکلا اور سگریٹ کو اٹھا کر پھر پلنگ کے نیچے غائب ہو گیا۔“ سب کے سب سہم گئے۔

”اور خواتین و حضرات! میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ ہاتھ کسی زندہ شخص کا نہیں تھا۔ بالکل سوکھا ہوا اور زندہ ہاتھ تھا۔ خیر! میں نے آیتہ الکرسی پڑھی۔ سوچا کہ شاید وہم ہوا ہو گا اور کچھ لگنٹا نے لگا۔ خیال آیا کہ اب سو جانا چاہئے۔ چنانچہ میں نے یونہی کہہ دیا۔“ ارے یہ بجلی جل رہی ہے اسے تو بچھانا بھول ہی گیا۔“ یہ کہہ کر اُٹھنے لگا تھا کہ ”تک“ سے آواز آئی اور کسی نے بجلی بچھا دی۔ اب برویں اس کمرے سے ہڑبڑا کر بھاگا ہوں تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔!“

”پھر کیا ہوا؟“ ایک طرف سے آواز آئی۔

”پھر ہم نے اس مکان کا کونا کونا تلاش کیا۔ پلنگ کے نیچے بھی دیکھا لیکن

کچھ نہ ملا سو یہ کمرہ آسیب زدہ ہے۔ اور۔ ارے!۔ یہ مرغی کہاں سے آگئی؟“ شیطان نے ایک تاریک گوشے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ سب لوگ اٹھ

کھڑے ہوئے۔

”افوہ!“ شیطان نے اُچھلتے کودتے ہوئے کہا۔ ”غضب خدا کا۔ یہ مجھے۔“
گدگدیاں کون کر رہا ہے۔“ اور بے تحاشا چیلانگیں لگانے لگے۔

”یہ میرے کان میں چیخیں کون مار رہا ہے؟“ شیطان چلا کر بولے۔ ”اور
یہ پردے کے پیچھے سے اونٹ کیوں جھانک رہا ہے؟“

اور کمرے میں ہلچل مچ گئی۔ شیطان نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے چپکے سے
بجلی بجھادی۔ اب جو دھماچو کڑی مچی ہے تو اللہ ان! سب کے سب کمرے سے
باہر نکل آئے اور برآمدے میں کھڑے ہو گئے۔

ذرا سی دیر میں لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ ہم پہلی منزل کے
برآمدے میں کھڑے تھے۔ وہ مولنا بھی ساتھ تھے اور نیچے جھانک رہے تھے۔
غالباً انتظار تھا انہیں کسی کا، اتنے میں ایک ٹانگہ گزرا۔ مولنا چلا کر بولے
”بھئی بھٹہرا تمہارا ٹانگی خالہ ہے کیا؟“

ادھر ٹانگے والے نے سُنا ہی نہیں، مجھے بڑی ہنسی آئی۔ لیکن شیطان بڑی
سنجیدگی سے بولے۔

”قبلہ! اگر آپ یوں فرماتے تو بہتر تھا۔ کہ تمہاری خالہ ٹانگی ہے کیا؟“
مولنا جھینپ گئے، اُنھوں نے جان بوجھ کر تھوڑا ہی کہا تھا۔ یہی مُنہ سے
نکل گیا۔ دیسے وہ ڈرے ہوئے ضرور تھے۔

”ٹانگے کا انتظار ہونا رہا۔ شیطان مولنا سے بولے۔ ”کیوں صاحب آپ
کی بجلی میں کیا کھڑا ہے؟“

”بارہ بجنے والے ہیں۔“ وہ بولے۔

شکوہ

”میرے خیال میں اب چلنا چاہئے۔ سڑک پر ٹانگہ ضرور مل جائے گا۔“ اور ہم تینوں نیچے اترنے لگے۔

”قبلہ ان سیڑھیوں کے متعلق بھی ایک پراسرار قصہ ہے، جسے میں اس اندھیرے میں سنانا نہیں چاہتا۔“ اور مولانا اور بھی آہستہ آہستہ اترنے لگے۔

”اجی آپ تو بچے کر کر کے اتر رہے ہیں۔ ذرا جلدی کیجئے۔“ شیطان بولے۔
”ویسے ہی ذرا۔ چکنی سیڑھیاں ہیں۔ کہیں۔“ وہ بولے۔

”جی ہاں! واقعی! سیڑھیاں اترتے چڑھتے وقت ضرور خیال رکھنا چاہئے۔“ کیونکہ پرسوں ہی کا ذکر ہے کہ میں جلدی جلدی زینے سے اتر رہا تھا۔ یکلخت جو ایک پھسلی سے سیڑھا تو دوڑ تک سیڑھتا ہوا چلا گیا۔“

شیطان کو روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ میرے پاس آئے مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ میں اپنا جیب خرچ اور سکالرشپ وغیرہ سب ختم کر چکا تھا۔ یہ طے ہوا کہ حکومت آپا ہمیشہ امیر رہتی ہیں۔ اُن سے ادھار لئے جائیں۔ شیطان حکومت آپا کے پاس گئے اور بولے۔ ”ذرا باغ میں چلئے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“ وہ متعجب ضرور ہوئیں۔ باغ میں پہنچے۔ وہاں شیطان نے چنگی بجائی اور بولے۔ ”ارے! وہ تو وہیں کمرے میں کہنا تھا۔“ اب پھر کمرے میں پہنچے، وہاں جا کر کچھ دیر سوچتے رہے، پھر بولے۔ ”میں بھی کیسا جھپٹی ہوں، دراصل وہ بات صرف چھت پر کہی جاسکتی ہے۔“ میں یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا ایک مختصر سی بحث کے بعد دونوں چھت پر پہنچے۔ وہاں جا کر شیطان نے التجا کی کہ اگر وہ بات دالان میں سنانی گئی تو بہتر رہے گا اور حکومت آپا چل گئیں۔ خیر! دالان میں پہنچے،

شیطان

وہ بولیں — ”اب میں یہاں سے ہرگز نہ ہوں گی۔“

شیطان بولے — ”تم ان دنوں بہت اچھی معلوم ہو رہی ہو۔“

اور حکومت آپا فرآ بولیں — ”روپے دراصل میرے پاس بھی نہیں ہیں۔“

شیطان بولے — ”یقین کرو کہ تم بہت ہی اچھی معلوم ہو رہی ہو۔“

وہ بولیں — ”یقین کیجئے کہ میں اس وقت بالکل قرض نہیں دے سکتی۔“

شیطان نے جلدی سے کہا — ”قرض کون مسخرہ مانگتا ہے، میں تو صرف یہ کہنا

چاہتا تھا کہ تم پرسوں سے بہت حسین لگ رہی ہو۔ فقط پرسوں سے۔!“

اسی طرح دیر تک اُلٹی سیدھی ہانکنے کے بعد حکومت آپا کو یقین دلادیا کہ

واقعی یہ سچ کہہ رہے ہیں۔ وہ شرما گئیں اور آہستہ سے بولیں — ”کیا اچھا لگ رہا

ہے آخر؟“

”خدا جانے کیا اچھا لگ رہا ہے۔ لیکن پرسوں سے میری حالت محذوش

ہے محض پرسوں سے!“

”پرسوں کیا بات تھی ایسی؟“ وہ اور بھی شرما گئیں۔

”پرسوں جب تم اپنے کمرے میں بیٹھی بسور رہی تھیں تو میں اس وقت تم مجھے

بہت ہی اچھی لگیں، میں اسی انتظار میں رہا کہ تم روتی کب ہو۔ لیکن جب ایک

آنسر بھی نہ نکلا تو میری آرزوؤں کا خون ہو گیا۔ کاش کہ تم زور زور سے روتیں۔

خیر! اگلی مرتبہ جب کبھی رونے کا پروگرام ہو مجھے ضرور بلانا۔“

اب تک ہمیں پتہ ہی نہ چل سکا کہ رضیہ ہر وقت کس کے متعلق سوچتی رہتی

ہے۔ ویسے ہمیں یہ یقین تھا کہ اُسے کسی نہ کسی کا خیال ضرور رہتا ہے۔ میری اور

شیطان کی یہی بحث رہتی۔ وہ عجیب عجیب حرکتیں مجھ سے کرواتے۔ ایک روز

شکر نے

بولے "رضیہ کو مونچھیں پسند ہیں۔ مونچھیں رکھ لو"۔ میں نے رکھ لیں۔ پھر بولے "اُسے برابر مونچھیں پسند نہیں، ایک طرف کی بڑی ہو دوسری طرف کی چھوٹی ہو"۔ میں نے کچھ روز اپنی ہنسی اڑوائی۔ پھر بولے "اسے مونچھیں پسند ہی نہیں چنانچہ صاف کرادی گئیں۔"

ایک دن مجھے رضیہ کو اس کی کسی سہیلی کے ہاں چھوڑنے جانا تھا۔ شیطان بولے "خوب اچھے سے کپڑے پہن کر جانا، رضیہ کے ساتھ چلو گے۔" شان رہے گی۔" میں پوچھ بیٹھا کہ رضیہ کو کس قسم کا لباس پسند ہے۔ یہ بولے "تم اسی وقت جا کر سُرُخ رنگ کی پتلون پہن لو اور سبز رنگ کا کوٹ۔ زرد رنگ کی ٹائی، براؤن جوتے، نیلی قمیص اور فاختی رنگ کا رومال، جاؤ ابھی پہن کر آ جاؤ۔" اور جب میں اور رضیہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے تو جو بھی راستے میں ملتا وہ نہ صرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے گھورتا۔ بلکہ دیر تک مُڑ مُڑ کر دیکھتا جاتا۔ آخر رضیہ بولی۔ "یہ آپ کو سُوجھی کیا ہتی؟"

"کیا۔؟"

"یہ لباس کیسا پہن آئے ہیں۔ بالکل ٹیکنی کلر (TECHNI COLOUR) میں رنگے ہوئے ہیں۔"

ایک دن اچانک شیطان نے نہایت لاجواب تجویز سوچی کہ ایک ڈراما سٹیج کیا جائے جو میرے نام سے مشہور کیا جائے اور انتظام سارا شیطان کریں گے۔ تجویز معقول تھی۔ رضیہ پر تھوڑا سا رعب جمایا جاسکتا تھا۔

پورے مہینے بھر کی تیاریوں کے بعد ہم نے ایک رومان اگیز ڈراما تیار کر لیا۔ اب ڈرامے کے نام کا سوال آیا تو شیطان بولے۔ "اس کا نام 'بے گناہ اونٹ'،"

شیطان

ٹھیک رہے گا۔

”لیکن اس کا پلاٹ تو ردِ مانی ہے اور اس میں اُونٹ کہیں بھی نہیں آتا۔“

”آج کل لوگ ایسے اچھوتے خیالات پر توجان چھڑکتے ہیں — یہ بہترین

نام ہے اور بھی نام ہیں۔ مثلاً مفلس عاشق — یا پریم کا جادو — یا —! —
اور میں فوراً مان گیا۔

”اچھا! اب اس کا عرف ضرور ہرنا چاہئے۔ عرف کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

ابھی میں نے ایک نہایت پُر اثر اور درد انگیز ردِ مانی افسانوں کی کتاب پڑھی ہے۔

جس کا نام تھا — ”آنسو اور ستارے“ عرف ”اس نے حجامت کی“۔ اس عرف

نے مجھ پر اس قدر اثر کیا کہ میرے آنسو نکل آئے۔“

”تو پھر رکھ لو عرف۔ کیا رکھو گے؟“

”میرے خیال میں تو یوں ٹھیک رہے گا۔“ بے گناہ اُونٹ، عرف ”آبیل

مجھے مار۔“

”لیکن اس میں بیل بھی کہیں نہیں آتا۔“

”پھر وہی باتیں کہیں تم نے۔“ شیطان بولے، اور میں مان گیا۔

مجھے شہزادہ بنایا گیا، شیطان نے اپنا اصلی پارٹ کرنا قبول کر لیا، یعنی وہ شیطان

بنے، ایک صاحب پریوں کی شہزادی بنائے گئے اور ان کی حجامت اس بڑی

طرح کی گئی کہ چہرہ کھرچ دیا گیا۔ آس پاس کے بیشتر معزز حضرات مدعو کئے گئے۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایک یار جنگ بہادر صاحب تشریف لائے تھے۔

ان کی آمد باعثِ فخر تھی۔ کلب میں ایک بہت بڑے، ہجوم کے سامنے پردہ اٹھا۔

میں ایک اندھیرے باغ میں کودا، وہاں جلدی سے پریوں کی شہزادی پر

شگوفے

عاشق ہوا۔ پھر چاند کو طلوع ہونا تھا اور مجھے ایک درد انگیز تقریر کرنی تھی۔ اب میں عاشق ہو کر چاند کا انتظار کر رہا ہوں۔ ادھر چاند ہے کہ نکلتا ہی نہیں۔ آخر تنگ آکر میں نے بغیر چاند کے تقریر شروع کر دی۔ اتنے میں یککھٹ چاند طلوع ہوا اور بڑی تیزی سے آسمان (سینج) کو عبور کرتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ ایک قبچہہ پڑا۔ لیکن میں نے تقریر جاری رکھی۔ اب مچکے سے چاند پھر نکل آیا اور میں نے ایک گھٹنے کے بل جھجک کر دہنا ہاتھ بڑھا کر کچھ کہنا شروع کیا ہی تھا کہ جو دیکھنا ہوں تو چاند دوسری طرف پہنچ چکا تھا۔ اب جو اس طرف منہ کرتا ہوں تو چاند ادھر آ گیا۔ غرضیکہ میری اور چاند کی خوب آنکھ مچولی ہوئی۔

اسی طرح ایک نہایت خوبصورت سین پر یککھٹ سارے قمقمے بجھ گئے اور جب دوبارہ جلے تو سارا مزا کرکرا ہو چکا تھا۔ اب جو پردے کی مصیبت شروع ہوئی ہے تو میں جھنجھلا اٹھا۔ جب کہیں اچھا سا سین آیا دھڑام سے پردہ گر گیا اور لوگوں نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ خیر بڑی مصیبتوں کے بعد انٹرول ہوا۔ شیطان صاحب سینج پر آ کر فرماتے ہیں — ”خواتین و حضرات! میں ڈرامے کے پڑھو (میرا نام لے کر) کے متواتر اصرار پر ان کی طرف سے جناب یار جنگ، بہادر صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ سینج پر تشریف لا کر حاضرین کو ایک بھڑی یاد اور اسٹائیں۔ نیز ہمارا طلبچی بہت ہشیار ہے۔ خواہ کیسی ہی راگنی وہ چیخیں ساتھ چل نکلے گا۔“

حاضرین دم بخود رہ گئے اور وہ یار جنگ بہادر صاحب مع اپنے کنبے کے فوراً اٹھ کر چلے گئے۔ اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ میں شیطان سے کچھ کہتا۔ پردہ اٹھا۔ ذرا سی دیر میں شیطان کا پارٹ شروع ہونا تھا۔ اب جو شیطان

کو ڈھونڈتے ہیں تو وہ غائب۔ بڑی پریشانی ہوئی طے ہوا کہ جلدی سے ایک اور شیطان بنایا جائے۔

سین تھا کہ پریوں کی شہزادی باغ میں ٹہل رہی ہے اور اسے ایک قہقہہ سناؤ دیتا ہے۔ وہ چونک کر کہتی ہے۔ میں خوب سمجھتی ہوں یہ تو شیطان ہے اور مجھے ڈرانا چاہتا ہے۔ لیکن میں تجھ سے ہرگز نہیں ڈروں گی۔ یہ کہہ کر وہ ایک گانا گاتی ہے۔

قہقہہ نقلی شیطان سے لگایا گیا۔ ہیروئن نے اپنے فقرے کہہ دیئے۔ یکلخت ایک دھماکا ہوا۔ سیٹج کی چھت سے ایک شعلہ ساڑپا اور دھم سے کوئی عجیب الحقت چیز کوڈی۔ جس کا رنگ سبز تھا۔ آنکھوں کی جگہ دو چنگاریاں دہک رہی تھیں، دو چمکیلے سینک تھے۔ نکیلے کان اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ نہایت ہیبتناک شکل تھی۔ ہیروئن نے ایک دلدوز بیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔ ہم سب حیران رہ گئے۔ اب غور سے دیکھتے ہیں تو یہ اصلی شیطان (رونی) تھے۔ جو اپنا میک اپ خود کر کے آئے تھے۔

ہیروئن اس قدر ڈری ہوئی کہ اس نے ایک عجیب بے ڈھنگے سُر میں گانا شروع کیا۔ ”رس کے بھرے تورے نین“۔ اس کا ترنم بالکل انگریزی موسیقی معلوم ہو رہا تھا۔ شیطان نے نہایت ہیبتناک آواز میں ہنسنا شروع کر دیا اور بے شمار بچے چلا چلا کر رونے لگے۔ جو بچہ روتا اُسے گھر بھیج دیا جاتا تھا۔

اب جو ڈراؤنا ایکٹنگ شیطان نے شروع کیا ہے تو حاضرین پر ایک سناٹا طاری ہو گیا۔ ایک ایک کر کے سب خواتین چلی گئیں۔

غرضیکہ شیطان نے دل کھول کر دھماچو کڑی چائی۔ آخر میں تو یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ انھوں نے بلاوجہ خود ساختہ فقرے بولنے شروع کر دیئے اور ہر

شکر فر

سین میں سیٹج پر آنا شروع کر دیا۔ خواہ ان کا پارٹ ہو یا نہ ہو۔ پھر وہ سین آیا جس میں شیطان کو جادو کے منتر سے ہلاک کرنا تھا۔ میں نے منتر کئی مرتبہ پڑھا۔ لیکن شیطان ٹس سے مس نہ ہوئے۔ میں نے چپکے سے کہا — ”اب مڑ بھی جاؤ“۔ پرامپٹر نے بھی کہا — ”مر جائیے رونی صاحب“۔ سیٹج کے پیچھے سے آواز آئی۔ ”مر جائیے قبلہ“۔ لیکن وہ پھر بھی نہ مرے۔ آخر میں نے غصے سے کہا — ”مرتے ہو یا نہیں؟“

شیطان زور سے بولے — ”نہیں مرتے“۔ اور لوگ ہنسنے لگے۔

”اچھا تو یہ بات ہے؟ — اٹھوں پھر؟“ میں سچ مچ اُٹھنے لگا تھا۔ پھر خیال آیا کہ شہزادوں کی شان کے شایاں نہیں کہ معمولی سے شیطان پر ہاتھ اٹھائیں۔ چنانچہ میں نے تالی بجائی۔ چند سپاہی آگئے۔ اُن سے کہا۔ ”لے جاؤ اس شیطان کو گرفتار کر کے قتل کر دو۔“

”جہنم میں بھیج دو۔“ حاضرین میں سے کسی نے نعرہ لگایا۔

”ہاں قتل کر کے جہنم میں بھیج دو۔“

”نہیں جاتے ہم۔“ شیطان نے اپنے لمبے لمبے نیکیے ناخن دکھاتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو پھر لاحول دلاؤ!“ میں نے زور سے کہا۔

اور شیطان یکلخت اُچھلے اور چھلانگ مار کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔

اس کے بعد مجھ پر چاروں طرف سے بوجھاڑ ہوئی۔ سب کچھ میرے ذمے

منڈھ دیا گیا۔ شیطان صاف بچ گئے۔ حکومت آپا نے مجھ سے کہہ دیا کہ میں کچھ

خطی سالر کا ہوں ورنہ اس قسم کی حرکتیں کبھی نہ کرتا۔ اور یہ بھی کہا کہ ڈرامے کے

دوران میں میں رقصیہ کو گھورتا رہا تھا لیکن رقصیہ کے متعلق پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس

کچھ روز بہت پریشانی رہی۔

حکومت آپا کی سالگرہ پر ایک دعوت ہوئی۔ ان کی سہیلیاں آئیں۔ بزرگوں نے شمولیت سے عداً پرہیز کیا۔ میں اور شیطان بھی شریک تھے۔ سب کے سب حکومت آپا کی ال ٹپ انہیں سُن رہے تھے اور برداشت کر رہے تھے۔ وہ اپنی کار کا ذکر بار بار کر رہی تھیں۔ جج صاحب چاہتے تو اچھی خاصی کار لے سکتے تھے لیکن نہ جانے انہیں اس فضول سی موٹر سے کیا دلچسپی تھی جو اس پر بُری طرح فریفتہ تھے۔ اُدھر ان کا سارا کنبہ اسی چیز پر لٹو تھا لیکن ہمیں وہ نہ ہر دکھائی دیتی تھی۔ آخر شیطان نے آہستہ سے کہا۔ دیکھو حکومت اگر اب تم سب اپنی کار کے متعلق ایک لفظ بھی کہا ہے تو۔!“ لیکن اُن پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ بدستور اپنی کار کے قصیدے پڑھتی رہیں۔ اب شیطان اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سب متوجہ ہو گئے۔ یہ گلا صاف کر کے بولے۔

”خواتین و حضرات! آج میں چند الفاظ اُس چیز کے متعلق کہنا چاہتا ہوں جسے

غلطی سے کار کہا جاتا ہے۔ جو قطعی طور پر بے کار ہے۔ اس میں جب تک چند میزیں، کرسیاں اور مونڈھے نہ رکھے جائیں یہ چلتی نہیں (وہ کار بہت ہی لمبی تھی) اور جب تک بیس پچیس آدمی نہ بیٹھیں، اپنی جگہ سے نہیں ہلتی۔ آپ اُسے پٹرول سے ہرگز نہیں چلا سکتے۔ جب تک اس میں مٹی کے تیل، سرسوں کے تیل اور دیگر چیزوں کا ایک خاص مرکب نہ ڈالا جائے یہ نہیں چلے گی۔ آپ اُسے پہاڑ پر چڑھائیں تو فوراً چڑھ جائے گی لیکن نشیب پر رک جائے گی اور ہرگز نیچے نہیں

شکر گئے

اُترے گی۔ لہذا کچھ پتہ نہیں کہ یہ چلتی کب ہے اور بھرتی کب ہے۔ اپنی مرضی کی مالک ہے۔ اس میں مارن کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کی مشین کا آرکسٹرا آدھ میل سے سُنائی دے جاتا ہے۔ لوگ ادھر ادھر بٹ جاتے ہیں۔ چوک کا سپاہی کانوں میں انگلیاں دے کر آنکھیں میچ لیتا ہے اور جل تو جلال تو پڑھتا ہوا ایک طرف ہو جاتا ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیتی ہیں۔ راغبیر سہم جاتے ہیں اور دیر تک ہسے رہتے ہیں۔ ہمارے پڑوس میں اس چیز کا وہ رعب ہے کہ بچوں کو اس سے ڈرایا جاتا ہے۔ ایک دن اس میں دودھ سے بھرا ہوا برتن رکھا تھا۔ جب تین چار میل جانے کے بعد کھولا گیا تو دودھ پر مکھن تیر رہا تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ پک نمک پر جاتے وقت ہم جلدی میں آئیں کریم نہ بنا سکے۔ البتہ آئیں کریم کی مشین میں دودھ برف وغیرہ بھر کر مشین کا ریم رکھ لی، جب دواں پہنچے تو نہایت ہی اعلیٰ درجے کی آئیں کریم تیار ہو چکی تھی۔“

اب جو معتبر ذرائع سے اطلاعات ملیں تو میں مسرت سے بے قابو ہو گیا۔ مجھے بنایا گیا کہ رضیہ کو محض میرا خیال ہے، وہ کھینچی کھینچی ضرور رہتی ہے۔ لیکن اس کی وجہ حکومت آپا ہیں۔

میں سیدھا شیطان کے پاس گیا اور کہا کہ اب تو ہم یقین ہو جانا چاہئے۔ میری حالت ان دنوں عجیب سی تھی۔ جو کچھ شیطان کہتے میں فوراً یقین کر بیٹھتا۔ پہلے تو انھوں نے حسب معمول رضیہ سے بزار کرانے کی کوشش کی۔ اُس کے خیال سے باز آجانے کے لئے کہا۔ جب میں نہ مانا تو کہنے لگے کہ ”دُنیا بہت وسیع ہے اور رضیہ کی نگاہ بھی کمزور ہے۔“ میں پھر بھی نہ مانا تو انھوں نے ایک عجیب ادٹ پڑاگ سی تجویز بتائی۔ کہ میں رضیہ کو باغ میں لوں۔ واپسی میں اناروں کے مجسٹ

کی طرف آؤں اور دہاں جو گرٹھا ہے اس میں گر پڑوں اور بے ہوش ہو جاؤں۔
رضیہ ضرور سُردبائے گی، پھر غنودگی میں بڑبڑانے لگوں اور رضیہ سے اصل بات
صاف صاف کہہ دوں۔ بس اُس وقت جو جواب ملے گا وہ آخری ہوگا۔

میں ہچکچایا۔ شیطان بولے۔ ”یہ آخری آزمائش ہے۔ اس مرتبہ ضرور فیصلہ
ہو جائے گا۔ اس لئے ہمت کر ہی ڈالو۔“ اور میں تیار ہو گیا۔ میں نے نفی کو جاسوس
بنایا کہ جوہنی رضیہ باغ کی طرف جائے مجھے فوراً اشارہ کر دے۔ اشارہ پانے ہی
میں بھاگا اور رضیہ کو باغ میں جالیا۔ پہلے تو اپنے ڈرائے کے متعلق پوچھا۔ بولی۔
”کچھ ایسا بُرا نہیں تھا۔“ پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ جب واپس آنے
لگے تو میں اُسے اناروں کے جھنڈ کی طرف لے گیا۔ اب وہ چھوٹا سا گرٹھا آیا جہاں
مجھے گرنا تھا، گڈنڈی سے گرٹھا دُور تھا۔ اس لئے میں گھاس پر چلنے لگا۔ اور یکلنت
خواہ مخواہ ٹھوکر کھا کر گرٹھے میں کچھ اس طرح گرا کہ سچ مچ چوٹ لگی۔ دراصل گرنے کی
ریہرسل نہیں کی گئی تھی۔

رضیہ گھبرا گئی۔ اُس نے مجھے ہر ش میں لانے کی ترکیبیں کیں۔ بیچاری فوارے
سے پانی بھی لائی۔ بھلا میں کہاں ہوش میں آنے لگا تھا۔ میں نے ہدایت نمبر تین
کے مطابق سرگوشی میں کہا۔ ”رضیہ!“ اور آنکھ جھپکا کر اسے دیکھا بھی۔

پھر آہستہ سے کہا۔ ”رضیہ!“ اور وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ اب میرا سر
دبایا جا رہا تھا۔ کہنے کو تو میں کہہ گیا تھا۔ لیکن مارے ڈر کے بُرا حال تھا۔ پورے ایک
منٹ کے وقفے کے بعد پھر کہا۔ ”رضیہ!“ اور رضیہ مچکے سے بولی۔ ”ہاں!“

اور میں جیسے آسمانوں میں اُڑنے لگا۔ اب اُس نے میرا سراپنی ہتھیلی پر رکھ
لیا اور میرے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ فیصلہ کن جواب مل چکا تھا۔ میرا جی چاہتا

شکوفے

تھا کہ ناچنے لگوں۔ رضیہ کی انگلیاں بالوں سے کھیلتی کھیلتی گردن تک پہنچیں اور جو بے تحاشا گدگدی ہوئی ہے تو سارے جتن کر ڈالے، ہونٹ چبائے۔ چٹکیاں لیں۔ بہتر اضط کیا، لیکن وہ کمبخت گدگدی قابو میں نہ آئی اور میں کھکھلا کر منہس پڑا۔ اب جو رضیہ ناراض ہوئی ہے تو بس!

چلتے ہوئے بولی۔ ”مجھے یقین تھا کہ ڈراما ہو رہا ہے۔ بھلا اس تماشے کی کیا ضرورت تھی۔“

اور میں نے سوچا کہ اس میں میرا کیا قصور ہے، گدگدی سب کو ہوتی ہے، کسی کو کم کسی کو زیادہ۔ بس رنج تھا تو یہ کہ اب رضیہ کبھی مجھ سے بات نہ کرے گی۔
— سارا معاملہ چرپٹ ہو گیا۔

اگلی شام کو انتہائی اُداسی میں شیطان کو سارا قصہ سنایا۔ وہ بولے۔ ”پہلے تو مجھے شبہ تھا لیکن اب یقین ہو گیا ہے کہ رضیہ تمہیں پسند نہیں کرتی۔ اس میں رنجیدہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اپنی اپنی پسند ہے۔ کوئی اچھا لگا کوئی نہ لگا۔! اور جب محبت کا جواب محبت میں نہ ملے تو دہاں سے چلے جانا چاہئے۔ ایسے موقعوں پر آب دہرا کی تبدیلی حیرت انگیز اثر رکھتی ہے۔ اب تمہیں یہاں رہ کر افسردگی کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ بھئی تم یہاں سے چلے جاؤ اور سمجھ لو کہ رضیہ کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔“

میں اور بھی اداس ہو گیا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”جہاں بھی جاؤں گا۔ بہت ہی غمگین رہا کروں گا۔ کیونکہ مجھے رضیہ اچھی لگتی ہے۔ اُسے ہرگز نہیں بھلا سکتا۔“

ہم اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ آخر شیطان نے منو کر چھوڑا کہ اس

شیطان

وقت یہی بہتر ہے کہ میں چپکے سے چلا جاؤں، بغیر جج صاحب کو اطلاع دیئے۔

”اور کالج کے سرٹیفکیٹ؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ سب میں بھیج دوں گا۔“ شیطان بولے۔ اور ذرا سی دیر میں میں سامان باندھ

رہا تھا۔ شیطان میری مدد کر رہے تھے۔

اتنے میں حکومت آپا آگئیں۔ پیچھے پیچھے ننھی تھی۔ مجھے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ

رکھتی تھیں۔ میں نے جلدی سے صندوق بند کر دیئے۔

میری اور شیطان کی یہی خواہش تھی کہ یہ کسی طرح یہاں سے چلی جائیں۔

شیطان بولے۔ ”ننھی! دیکھ تو سہی ساتھ کے کمرے میں جو کلاک ہے وہ چل

رہا ہے یا نہیں؟“

ننھی واپس آکر بولی۔ ”کلاک چل تو نہیں رہا۔ کھڑا ہے، بس اپنی دُم ہلا

رہا ہے۔“

شیطان بولے۔ ”تو گویا چل رہا ہے نا؟“

”چل کہاں رہا ہے؟ چل کس طرح سکتا ہے بیچارہ؟ میخوں سے تو گاڑ رکھا

ہے۔ بس اپنی دُم ہلا رہا ہے۔“ ننھی نے وضاحت کی۔

حکومت آپا مہنس دیں۔

شیطان چڑ کر بولے۔ ”یہ بڑی ہو کر ہو بہو حکومت بنے گی، شاباش ہے

حکومت کیا لاجواب ٹریننگ دی ہے۔ اس بچی کو، ستیاناس کر دیا۔“ حکومت

ابھی کچھ کہنے ہی لگی تھیں کہ شیطان بولے۔ ”تہیں چاہئے کہ اسے سارے سبق پڑھا

کر ایک سرٹیفکیٹ دے دو۔ اس طرح۔ کہ میں نے پورے چار سال تک

اس بچی کو اپنے ساتھ رکھا۔ اور اسے اچھی طرح لگاؤ کی کوشش کی ہے۔ اب

تنگوفے

میں بڑے غر سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ ایک گستاخ، چھچھوری، پٹھوری اور ضدی لڑکی بن گئی ہے۔ لوگوں پر خواہ مخواہ فقرے کہنے میں تو اس نے مجھے بھی مات کر دیا ہے ہر ایک سے چیخڑ، بزرگوں کا حکم نہ ماننا، اپنا وقت ضائع کرنا۔ ان میں یہ ایسی ماہر ہو گئی ہے کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں بھی یہ جائے گی، میرا نام روشن کرے گی۔ میری بدترین دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔ اس پر حکومت آپا نے ایک تیز سا جواب دیا اور باہر جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں، سختی بولی — ”بھیا! اب تو آپ حکومت آپا کو ڈانٹ لیتے ہیں، ذرا ان کی شادی ہو جانے دو۔ پھر دیکھیں گے انہیں کون دھمکاتا ہے۔“

”اچھا تو حکومت کی شادی بھی ہوگی؟ — کون کہتا ہے؟“ شیطان نے حیران ہو کر پوچھا۔

اب حکومت آپا ابل پڑیں، بولیں — ”اور تمہاری بڑی ہوگی، دیکھ لینا جو کئی لڑکی تمہارے نزدیک بھی کھڑی ہو جائے تو۔۔۔۔۔ خواہ مخواہ رنصیہ کو بھی پریشان کر رکھا ہے اور (میری طرف اشارہ کر کے) اس بے چارے کو بھی۔“

۔۔۔ اس پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔

”حکومت تم جا کر کوئی مفرح شربت پیر تمہاری صحت —!“

”مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ تم —!“

”خاک تھا تمہیں پتہ۔“

”اچھا تو کہہ دوں سب کچھ کہ تم نے بچارے کو —!“

”تم اپنا وقت بھی ضائع کر رہی ہو اور دوسروں کا بھی۔“

— اور شیطان اور حکومت آپا کی خوب لڑائی ہوئی۔ حکومت آپا نے

سب کچھ بتادیا۔ مجھے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔

میں نے شیطان کو کالہ رسے پکڑ لیا اور پوچھا۔ ”کیا سچ مچ تم رضیہ کو میرے خلاف درغلاتے رہے ہو؟“

وہ بولے۔ ”ہاں۔“

”ڈرامے میں تم نے ہی گڑبڑ کی تھی اور وہ خود کشی تم نے ہی خراب کرائی تھی؟“

”ہاں! ہاں!!“

”اور وہ۔!“

”ہاں! ہاں!! ہاں!! میں نے سب کچھ کیا تھا اور ابھی بہت کچھ کر دوں گا لیکن یہ سمجھ لو کہ رضیہ تمہیں بالکل پسند نہیں کرتی اور اُس کی نظر بھی کمزور ہے۔ میں نے شیطان کو اپنی طرف کھینچا اور اپنا مکا۔“

اتنے میں جج صاحب آگئے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ بولے۔ ”میں نے سب کچھ سُن لیا ہے بیٹے جاؤ۔ جب میں یورپ میں تھا تو وہاں ایک لڑکے سے میری کھٹ پٹ ہو گئی۔ ہمارے پروفیسر نے ہیں جھگڑتے دیکھ لیا اور کہا کہ تم دونوں کے دلوں میں غبار ہے جسے نکال دینا نہایت مفید ہوگا۔ تم کسی نہ کسی دن آپس میں لڑو گے ضرور۔ چنانچہ وہ ہمیں کھیل کے میدان میں لے گئے اور وہاں GLOVES پہنا کر مکہ بازی کرائی۔ ہم خوب لڑے۔ یہاں تک کہ دونوں تھک کر گر پڑے اور جب ہم واپس آئے تو بڑے اچھے دوست بن گئے تھے۔ اب تم دونوں ضرور آپس میں لڑو گے اس سے بہتر یہی ہے کہ ہم سب باغ میں چلیں۔ تمہارا

شکر فری

فیصلہ وہاں ہو جائے گا۔ انھوں نے گلوں منگوائے اور ہم سب کمرے سے باہر نکل آئے۔ نہایت ہی دلفریب چاندنی رات تھی۔ میں بے حد اُداس تھا۔ ہر دفعہ تصور میرا ہی نکلتا ہے۔ جہاں جاتا ہوں کوئی نہ کوئی گُل کھلاتا ہوں۔ مجھے چاہئے تھا کہ چپ چاپ یہاں سے چلا جاتا۔ جب رضیہ کو مجھ سے نفرت ہے تو پھر بات کیا رہ گیا۔ اب یہ بات سب میں پھیل جائے گی۔ اور تو اور جج صاحب نے بھی سب کچھ سُن لیا، توبہ! توبہ! — ایک تماشا اور بات رہ گیا تھا۔ سودہ اب ہو رہا ہے۔ بس میں رات کی ٹرین سے گھر چلا جاؤں گا اور پھر کبھی مُنہ نہ دکھاؤں گا۔

پلاٹ میں بجلی کے قتمے جل رہے تھے، طے ہوا کہ وہاں مقابلہ ہو۔ یہیں گلوں پہنائے گئے۔ جج صاحب نے کھڑی ہاتھ میں لی، ہمارے چاروں طرف سارا کُنُبہ کھڑا تھا۔ جج صاحب نے پوچھا۔ ”کتنے راؤنڈ؟“ میں نے کہا۔ ”جتنے آپ چاہیں!“ شیطان بولے۔ ”تین!“ جج صاحب نے کہا۔ ”تین میں تو فیصلہ نہیں ہوگا، پانچ سہی۔“

پہلا راؤنڈ شروع ہوا۔ نہ جانے میرے ہاتھ پاؤں کیوں شل ہو رہے تھے میں بغیر کسی مَدافعت کے شیطان سے پٹ رہا تھا۔ سب نیچے میری طرف تھے اور ہمت بندھا رہے تھے۔ رضیہ ایک طرف اکیلی کھڑی تھی۔ بالکل چپ چاپ پہلا راؤنڈ شیطان کا رہا۔ دوسرے میں پھر انھوں نے پیٹنا شروع کیا اور میں بُت بنا کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ میرا ایک مُٹکا بھی اُن کو نہ لگ سکا۔ نیچے چلا چلا کر میرا دُورصلہ بڑھانے والی کوشش کر رہے تھے اور میں نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ شاید

شیطان

یہی کہ مقابلہ ختم ہوتے ہی فوراً یہاں سے چلا جاؤں گا۔ ایک، ٹرین رات کے گیارہ بجے جاتی ہے۔

تیسرے راؤنڈ میں یہی ہوا۔ شیطان اُچھل اُچھل کر حملہ کرتے تھے اور میری جانب سے مدافعت تک نہ ہوتی۔

تیسرا راؤنڈ ختم ہوا۔ میں بیٹھا ہی تھا کہ رضیہ نے میرے کان میں کچھ کہہ دیا۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا — ”سچ؟“

بولی — ”ہاں!“

اور میری آنکھوں کے سامنے تتلیاں ناچنے لگیں۔ میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ چونکا راؤنڈ شروع ہوا۔ میرے گلووز نے حرکت کی۔ دھڑام — دھڑام — چند آوازیں آئیں اور شیطان بے ہوش پڑے تھے۔

وہ ناک آؤٹ ہو گئے تھے۔ جج صاحب نے میرا بازو ہوا میں بلند کر کے ہلا دیا۔ اور رضیہ میرے گلووز اتارنے لگی۔

حکومت آپا بولیں۔ ”مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔!“

میں اور رضیہ فرارے کے پاس سے گزر رہے تھے۔ راستے میں ہم نے وہ گڑھا بھی دیکھا جہاں میں گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہم دونوں مسکرانے لگے۔ نہایت ہی دلفریب چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ ایسی چاندنی میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے سوچا کہ رضیہ نہایت ہی خوبصورت لڑکی ہے اور ایسی لڑکی بھی کبھی نہیں دیکھی تھی — اور جب ہم معطر پھولوں کے تختوں میں سے گزر رہے تھے تو فضا میں ایک سناٹا تھا — خوشگوار سناٹا — تب مجھے پتہ چلا کہ شیطان تو میرے رقیب تھے اور حکومت آپا اپنا وقت بھی ضائع کر رہی تھیں اور دوسروں کا بھی۔